مرزائیت

نئے زاویوں سے

مولانا محمد حنیف ندویؒ

مرتب
محمد سرور طارق

طارق اکیڈمی فیصل آباد

مرزائیت

نئے زاویوں سے

مولانا محمد حنیف ندویؒ

مقدمہ : مولانا محمد اسحٰق بھٹی

مرتب : محمد سرور طارق

طارق اکیڈمی

ڈی گراؤنڈ (سموسہ چوک) فیصل آباد فون 546964

مرزائیت

نئے زاویوں سے

مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ

مقدمہ : مولانا محمد اسحٰق بھٹی

مرتب : محمد سرور طارق

طارق اکیڈمی

ڈی گراؤنڈ (سموسہ چوک) فیصل آباد فون 546964

مرزائیت

نئے زاویوں سے

مولانا محمد حنیف ندوی رح

مقدمہ : مولانا محمد اسحٰق بھٹی

مرتب : محمد سرور طارق

طارق اکیڈمی

ڈی گراؤنڈ (سموسہ چوک) فیصل آباد فون 546964

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	مذہب وریاست کے موجودہ تقاضے اور نبوت	
9	**نبوت ورسالت، جھوٹ اور سچ کا فرق**	154
	ختمِ نبوت کے معنی	
	نبوت ورسالت کا عام فہم معیار	
	اللہ کا معیار انتخاب	
	کیا یہ پیغمبر ہے؟	
	دو مختلف دعوے (نبوت۔تجدید)	
	جھوٹا نبی اور سچا نبی	
	پیشن گوئی کا پنجرہ	
10	**خلافتِ مرزائیہ۔** (انتہائی اہم اور اصولی بحث)	201
	خلیفہ معزول ہوسکتا ہے یا نہیں؟	
	خلیفہ کی شرعی حیثیت	
	مرزائی نکتۂ نظر	
	مرزائی استدلال یا فریب کاری	
11	**سیاسی پس منظر، برٹش گورنمنٹ سے وفاداری**	218
	مرزائیت کا سیاسی پسِ منظر	
	پیغمبر اور حکومتِ باطلہ کی تائید	
	مرزائیت کی معذرت	
	نبوت سے دست برداری	

مولانا ندویؒ کا اسلوبِ نگارش

مولانا کئی حیثیتوں سے اپنی تخلیقات میں سامنے آئے ہیں۔ وہ ایک محقق ہیں، شارح ہیں، مفسّر ہیں، مترجم ہیں، نقاد ہیں اور مقدمہ نگار ہیں۔ اگر تعمقِ نظر سے ان کی فاضلانہ تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی اور حیثیتیں بھی واضح ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وہ عالمِ دین ہیں، فلسفی ہیں، منطقی ہیں، اور مؤرخ بھی ہیں۔ ان میں سے ہر حیثیت ایک خاص اسلوبِ نگارش کی مقتضی ہے۔

مولانا کا اسلوبِ نگارش عام منطقیوں کی طرح خشک، بے کیف، بے رنگ نہیں بلکہ ان میں ادیبانہ رنگ کی جھلک نمایاں محسوس کی جاتی ہے، ان کے ہاں دلائل آفرینی کے ساتھ ساتھ تخلیقی حسن و جمال بھی ہے۔

میں نے دینی علوم کے تین بڑے مفکروں کی تحریریں پڑھی ہیں۔ ان میں سے پہلے مولانا ابوالکلام آزادؒ ہیں، دوسرے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور تیسرے مولانا محمد حنیف ندویؒ، میں ان کے اسالیبِ بیان کا تجزیہ اس طرح کرتا ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اسلوب کا تصور کرتا ہوں تو میری نگاہوں کے سامنے ایک ایسی شوریدہ سَر ندی آ جاتی ہے جو طوفانی رفتار سے بہتی ہوئی، راستے کے بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتی ہوئی اور انہیں بہاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اسلوب کی مثال ایک ایسی صاف، شفاف، آئینہ رنگ ندی کی ہے جو پتھروں سے بچتی ہوئی، دھیرے دھیرے آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

مولانا حنیف ندویؒ کے اسلوب کو بھی ندی ہی کے توسط سے پیش کروں گا، مگر یہ ایک ایسی ندی ہے جو نہ تو طوفانی رفتار سے بہتی ہے، نہ اس میں داخلی اور خارجی نوعیت کا جوش و خروش ہے یہ پتھروں سے ٹکراتی بھی نہیں، مگر ان سے الگ بھی نہیں ہوتی، بلکہ بڑی ملائمت سے انہیں اپنی گود میں لے کر چپ چاپ چلی جاتی ہے۔

(مرزا ادیبؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

اگر چہ انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند پر غاصبانہ قبضہ کرتے ہی اسلامی تہذیب و ثقافت، اسلامی عقائد اور جذبہء جہاد کو ختم کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں، لیکن انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو جو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، وہ اس شجرۂ خبیثہ کی کاشت تھی، جسے مرزائیت کہا جاتا ہے، اس کے لئے انہوں نے اپنے خاص دوست خاندان کے ایک فرد مرزا غلام احمد کو چن کر اس سے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرایا تاکہ وہ ذہنی وفکری پریشانی اور ضعف میں مبتلا قوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کر سکیں۔ مرزا غلام احمد نے انگریزوں کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے یکے بعد دیگرے مجدد، مامور من اللہ، مثلِ مسیح، مسیحِ موعود اور بالآخر اپنے نبی و رسول ہونے کا دعویٰ کر کے ملتِ اسلامیہ کو انتشار و خلفشار میں مبتلا کر دیا اور عجیب بات یہ کہ ابھی تک اس نے اپنے مثلِ مسیح، مسیحِ موعود اور نبی و رسول ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا کہ بعض اہلِ اللہ نے اس کی تحریروں میں کفر و الحاد کی بو سونگھ لی تھی۔ مثلاً اس کی کتاب ''براہین احمدیہ'' کے پہلے دو حصوں کی اشاعت تک بعض علمائے دین اگر چہ حسنِ ظن کی بنا پر مرزا صاحب سے مانوس تھے مگر بعض علماء ربانی اور اہلِ اللہ ایسے بھی تھے، جنہوں نے اسی کتاب سے مرزا صاحب کے کفر و الحاد کی بو سونگھی اور اس خدشہ کا اظہار کیا کہ یہ شخص آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہے، ان

علماء ربانیین میں سے حضرت مولانا حافظ عبدالمنان محدث وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ، امرتسر کے اہل حدیث علماء، غزنوی اکابر اور کچھ دیگر علماء کرام بھی تھے۔ رحمھم اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ ان علماء کرام میں سے تھے جو اس دور میں مرزا صاحب کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے تھے لیکن جوں ہی مرزا صاحب نے کھل کر اپنی اصلیت کا اظہار کیا، تو سب سے پہلے حضرت مولانا محمد حسین بٹالویؒ نے ہی مرزا صاحب کو کافر قرار دیا۔ اور یہ اعزاز بھی مولانا بٹالویؒ ہی کو حاصل ہے کہ اسلام اور قادیانیت کے مابین جو سب سے پہلا مناظرہ لاہور میں ہوا تھا، اس میں مسلمانوں کی طرف سے مناظر مولانا بٹالویؒ تھے اور قادیانیوں کی طرف سے حکیم نور الدین۔ مولانا بٹالوی نے اس مناظرہ میں حکیم نورالدین کو ناکوں چنے چبوائے اور دلائل و براہین کی طاقت سے اس طرح لاجواب کر دیا کہ حکیم نورالدین مناظرہ درمیان میں ہی چھوڑ کر لدھیانہ فرار ہو گیا، جہاں ان دنوں مرزا غلام احمد قیام پذیر تھا، بہرحال مولانا بٹالویؒ نے ۱۵ اپریل ۱۸۹۱ء کو لدھیانہ میں مرزا صاحب کو تار ارسال کیا، جس میں تحریر تھا کہ آپ کا مریدِ خاص مناظرہ سے راہِ فرار اختیار کر کے آپ کے پاس پہنچ چکا ہے، اسے مناظرے پر آمادہ کریں یا پھر خود مناظرہ کے لئے تیار ہو جائیں۔

جس طرح مولانا بٹالویؒ نے اپنی زبان اور قلم سے مرزا صاحب کا تعاقب جاری رکھا، اسی طرح آپ کے استاد گرامی قدر شیخ الکل حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی نور اللہ مرقدہٗ، حضرت مولانا عبدالحق غزنویؒ، پیر مہر علی شاہؒ، علماء لدھیانہ اور بعض دیگر سینکڑوں علماء کرام ہیں، جنہوں نے انگریزوں کے

کاشت کئے ہوئے اس شجرۂ خبیثہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن جو شہسوار اس میدان میں سب سے سبقت لے گیا اور مرزائیت کے محاسبے میں شہرت کی آخری حدوں تک پہنچ گیا، انہیں دنیا فاتح قادیان شیخ الاسلام حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کے اسمِ گرامی اور نامِ نامی سے یاد کرتی ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اپنے آپ کو خدمتِ اسلام اور ردِ مرزائیت کے لئے وقف کئے رکھا، اس سلسلہ میں آپ کی گوناگوں خدمات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ ان کے تذکرہ کے لئے ہزاروں صفحات درکار ہیں۔

مرزائیت کے احتساب کی تاریخ طویل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ بہر آئینہ اس سلسلہ میں ایک بہت ہی محترم نام متکلمِ اسلام حضرت مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ کا بھی ہے، جن کی اس موضوع پر بہت ہی شاندار اور جاندار کتاب ''مرزائیت نئے زاویوں سے'' قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔ حضرت ندوی رحمہ اللہ کو اللہ ربِ ذوالجلال والاکرام نے علم و فضل کی جس وسعت، فکر و نظر کی جس گہرائی، اسلوبِ نگارش کی جس رعنائی و زیبائی اور استدلال کی جس محکمی و استواری سے سرفراز فرمایا تھا، معاصر علماء میں دور دور تک آپ کا کوئی سہیم و شریک نہیں تھا۔ زیرِ نظر کتاب...... مرزائیت نئے زاویوں سے...... آپ کے ان مقالات کا مجموعہ ہے، جو آپ کے دورِ ادارت میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں طبع ہوئے اور بعد میں ان میں سے کچھ ایک بار کتابی صورت میں بھی طبع ہوئے تھے۔

عزیزِ گرامی محمد سرور طارق ڈائریکٹر طارق اکیڈمی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے اس علمی گنجِ گراں مایہ کو نئی ترتیب دی اور متکلم اسلام

حضرت مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ کے اس موضوع پر تمام قلمی شاہ پارے جو پہلے مجموعے میں نہ آ سکے انہیں اس کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی کو قبول فرمائے۔ برادرِ محترم خالد اشرف کا علمی ذوق اور مشورہ بھی ان کے معاون رہا۔

اس کتاب کے مقدمہ کے لئے ہم نے ایک ایسی شخصیت کو زحمت دی ہے۔ جنہیں مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان میں، ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ میں، سفر میں، حضر میں، خلوت میں اور جلوت میں، سالہا سال تک حضرتِ ندوی رحمہ اللہ کی رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے، امید ہے کہ اب قارئین کرام کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری مراد نامور مفکر و دانشور صحافی و ادیب اور مترجم و مصنف حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ تعالیٰ سے ہے کہ ان سے بڑھ کر اور کوئی شخصیت اس کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لئے موزوں نہ تھی، ہم محترم مولانا بھٹی صاحب کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے بے حد وسیع مقدمہ لکھ کر حضرت مصنف کے حقِ رفاقت کو ادا کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں دنیا و آخرت کے حسنات و برکات سے نوازے، اسی طرح حضرت مصنف رحمہ اللہ کے لئے بھی ہم اللہ ربِ ذوالجلال والاکرام کے حضور دست بدعاء ہیں کہ وہ آپ کے اس صدقہ جاریہ کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور آپ کو اعلیٰ علیین میں بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ درجات سے سرفراز فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

محمد خالد سیف (نگران اعزازی)

طارق اکیڈمی

فیصل آباد

حرفِ چند

مولانا محمد اسحٰق بھٹی

بیسویں صدی کے نصفِ آخر میں برصغیر کے جن علمائے کرام نے علمی و تحقیقی خدمات سرانجام دیں، ان میں مولانا محمد حنیف ندویؒ کا اسم گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ قرآن وحدیث، فلسفہ وحکمت اور ادب وانشاء میں ان کا مقام بہت بلند تھا وہ صاف ذہن اور پختہ فکر عالمِ دین تھے۔ زبان کی چاشنی اور اظہارِ مدعا کی دلکشی میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

وہ 10 جون 1908ء کو گوجرانوالہ کے ایک محنت کش گھرانے میں پیدا ہوئے، پرائمری تک سرکاری سکول میں تعلیم پائی۔ 1921ء میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ گوجرانوالہ میں تشریف لائے اور انہوں نے درسِ قرآن اور خطبہ جمعہ کے ساتھ تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو محمد حنیف کے والد نورالدین نے بچے کو مولانا کے حلقہء تدریس میں شامل کر دیا۔ ذہن رسا پایا تھا اس لئے 1925ء (صرف چھ سال کے عرصے) میں مروجہ درسِ نظامی کی تکمیل کر لی اور اسی سال مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ نے اپنے اس ہونہار شاگرد کو مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا۔

ندوہ میں مولانا نے چار کام کیے۔

(1) مختلف علوم وفنون کی جو انتہائی کتابیں مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ سے گوجرانوالہ میں

پڑھی تھیں، ان میں سے بعض کتابیں وہاں ہرفن کے ماہر استاذ سے دوبارہ پڑھیں۔

(2) قدیم وجدید عربی ادبیات کی خاص طور سے تحصیل کی اور اس کے لئے مشہور اساتذہ سے استفادہ کیا۔

(3) اڑھائی سال میں تفسیرِ قرآن میں درجہ تخصص کیا اور عربی کی تمام تفسیریں نہایت غور اور محنت سے پڑھیں۔

(4) اردو زبان سیکھنے اور اہلِ زبان کا لہجہ اپنانے میں بے حد کوشش کی۔

پانچ سال 1925ء سے 1930ء تک وہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں تحصیلِ علم کرتے رہے اور ندوہ کے ذہین ترین طلبا میں گردانے گئے۔ طلباء ان کا انتہائی احترام کرتے اور اساتذہ ان پر بے حد شفقت کا اظہار فرماتے تھے۔

ندوہ میں انہوں نے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن ٹونکیؒ (وفات جون 1942ء) اور شمس العلماء مولانا حفیظ اللہؒ (وفات فروری 1944) سے خاص طور سے استفادہ کیا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ایک انتہائی عقیدت مند رفیق مولانا عبدالرحمٰن نگرامیؒ (وفات 2 مارچ 1926) بھی ان دنوں ندوہ میں عربی ادب کے استاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے تھے، محمد حنیف ندوی ان سے زیادہ استفادہ تو نہیں کر سکے، البتہ وہ ان کے عمل و کردار کی رفعتوں سے بہت متاثر ہوئے۔

1930ء میں وہ ندوہ سے فارغ ہو کر گوجرانوالہ آ گئے۔ اس زمانے میں انگریزی حکومت کے خلاف کئی سیاسی تحریکیں چل رہی تھیں اور برصغیر کے لوگ بالخصوص نوجوان انگریزوں سے شدید نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ پنجاب میں گوجرانوالہ کے باشندے انگریز کی مخالفت میں نہایت سرگرم تھے۔ مولانا محمد حنیف ندویؒ نے بھی انگریزی اقتدار کی مخالفت میں تقریریں کیں اور گرفتار کر لئے گئے۔

گوجرانوالہ کی عدالت سے چھ مہینے کی قید ہوئی اور قصور جیل میں بھیج دیئے گئے۔قید کی یہ مدت قصور کی جیل میں پوری کی۔

قید سے رہائی کے بعد حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری ؒ (وفات 15 مارچ 1948ء) کے مشورے سے مولانا محمد حنیف ندوی ؒ کو لاہور کی مسجد مبارک کا خطیب مقرر کر دیا گیا۔اس مسجد میں وہ خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے تھے اور مغرب کی نماز کے بعد روزانہ درس قرآن بھی دیتے تھے۔تفسیر قرآن ان کی دلچسپیوں کا خاص محور تھا۔ انہوں نے 1930ء سے 1949ء تک اٹھارہ انیس برس یہ خدمت انجام دی اور بے شمار لوگ ان سے مستفید ہوئے۔

اب ان کی تحریری کاوشوں کی طرف آیئے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا، ندوہ میں مولانا نے قرآن سے متعلق تخصص کیا تھا، پھر کم و بیش اٹھارہ برس وہ مسجد مبارک میں درس قرآن دیتے رہے، خطباتِ جمعہ میں خطیب حضرات کوئی ایک خاص آیت تلاوت کر کے خطبہ دیتے ہیں، جس میں ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا لیکن مولانا نے بالترتیب آغاز قرآن سے چلایا جو تقریباً دو دفعہ اختتام کو پہنچا۔یعنی شروع سے آخر تک دو قرآن انہوں نے صرف خطبات جمعہ میں ختم کیئے۔یہ ان کی قرآن سے بدرجہ غایت لگن اور محبت کی بہت بڑی دلیل ہے، بہت سے سامعین درس قرآن میں بھی ان کے بیان فرمودہ قرانی نکات ضبط تحریر میں لاتے تھے اور خطبات جمعہ میں بھی۔

1934ء میں انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی سراج البیان کے نام سے کئی دفعہ چھپی۔پہلے یہ تفسیر بڑے سائز کی دو جلدوں میں ملک سراج الدین (تاجر کتب کشمیری بازار لاہور) نے شائع کی تھی، جو بار بار چھپی تھی، اب چند سال پیشتر یہ بہت

باریک خط میں چھوٹے سائز میں پانچ جلدوں میں شائع کی گئی ہے، جن کے پاس پہلی اشاعتوں کی بڑی تقطیع کی تفسیر موجود ہے، ان کا بیان ہے کہ موجودہ اشاعت میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں بلکہ سطروں کی سطریں غائب ہیں۔

قیام پاکستان سے قبل لاہور میں پیکولمیٹڈ کا ایک ماہانہ رسالہ ''حقیقت اسلام'' کے نام سے شائع ہوتا تھا، قرآن کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مولانا ندوی کے اس میں بہت سے مضامین شائع ہوئے۔

''مطالب القرآن فی ترجمۃ القران'' کے نام سے پیکولمیٹڈ (لاہور) نے قرآن مجید کے ترجمہ وحواشی کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا، جو سید محمد شاہ ایم اے کے رشحات قلم کا نتیجہ تھا۔ مولانا نے اس پر نظر ثانی کی تھی، اس خدمت میں مولانا کے ساتھ مولانا شہاب الدین فاضل دیوبند اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی بھی شریک تھے۔

شرکتِ علمی لمیٹڈ (لاہور) کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ ''اسلامی زندگی'' جاری کیا گیا تھا۔ یہ نام مولانا نے ہی تجویز کیا تھا، اس میں قرآن وحدیث کے بارے میں مختلف موضوعات پر مولانا کے بہت سے مضامین شائع ہوئے۔ اس کی ادارت کے فرائض بھی مولانا نے انجام دیئے تھے۔

ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے متعدد شماروں میں ''ایک آیت کی تفسیر'' کے عنوان سے انہوں نے قرآن کی بہت سی آیات کی تفسیر لکھی، یہ سلسلہ کافی عرصہ تک چلا اور بے حد مقبول ہوا۔

15 مئی 1951ء کو وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہو گئے، وہاں انہوں نے قران سے متعلق ''مطالعہ قرآن'' کے نام سے کتاب لکھی، جو بڑے بڑے سولہ عنوانات پر مشتمل ہے اور اس موضوع کی نہایت اہم کتاب ہے۔

قرآن کی توضیحی لغت کے بارے میں انہوں نے ''لسان القرآن'' کے نام سے حروف تہجی کو ترتیب سے لکھنا شروع کیا، سلسلہ حرف الف سے شروع ہو کر حرف دال (دی ن) تک پہنچا تھا کہ مولانا وفات پا گئے۔ مطبوعہ مواد دو جلدوں کو محتوی ہے اور آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے......!

ان کی وفات کے بعد بہت سے اہل علم حضرات کے اصرار پر میں نے اسے حرف دال سے لکھنا شروع کیا، ساڑھے تیرہ سو صفحات کی ایک جلد حرف ''ف، ذ'' حرف ''را'' اور حرف ''زا'' کا احاطہ کئے ہوئے ہے، جو علم و عرفان پبلشرز اردو بازار لاہور کی طرف سے معرض اشاعت میں آئی ہے۔ اب حرف سین سے کام ہو رہا ہے۔ اگر زندگی رہی تو انشاء اللہ یہ سلسلہ مکمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن کام بہت مشکل ہے اور بہت وقت چاہتا ہے۔ اللہ ہی مدد کرنے والا ہے۔

قرآن مجید کی طرح حدیثِ رسول ﷺ سے بھی مولانا کو بے حد تعلقِ خاطر تھا۔ انکار حدیث کو وہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں لیکن خاتم النبیین ﷺ کی مخالفت اور انکار فرامین پیغمبر ﷺ کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جب بھی کسی نے حدیث پاک کو حرف تنقید ٹھہرایا، مولانا مقابلے میں آ کھڑے ہوئے، اس ضمن میں انہوں نے ہفت روزہ ''الاعتصام''، سہ روزہ ''منہاج'' اور دیگر بہت سے رسائل و جرائد میں لکھا اور نہایت مدلل زور دار لکھا۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے اس موضوع پر ''مطالعہ حدیث'' کے نام سے نہایت اہم اور قابلِ قدر کتاب شائع ہوئی ہے۔

ان کی تصنیفی خدمات کا سلسلہ بہت وسیع ہے، امام ابن تیمیہؒ کے حالات اور ان کی فلسفیانہ اور منطقیانہ تگ و تاز کے باب میں ''عقلیات ابن تیمیہؒ'' ان کی بہت

مشہور کتاب ہے، جو کئی دفعہ شائع ہو چکی ہے۔

اسلام کے بنیادی پہلوؤں اور اساسی ارکان یعنی توحید اور نماز وغیرہ کی وضاحت وتبیین کے ضمن میں ''اساسیات اسلام'' ان کی لائق تذکرہ کتاب ہے پھر ''مسئلہ اجتہاد'' ان کی وہ تصنیف ہے، جس نے تعلیم یافتہ حلقوں میں بڑی شہرت پائی کسی زمانے میں صحیح بخاری کے ترجمہ وتشریح کو بھی انہوں نے موضوع تحریر بنایا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے حدیث لکھی، پھر اس کا ترجمہ کیا، پھر سند کے راویوں کا ذکر اور حدیث کی تشریح غالباً یہ سلسلہ پانچ پارے تک پہنچا تھا، افسوس ہے مکمل نہ ہو سکا۔

ان کتابوں کے علاوہ ''افکار غزالی'' ''تعلیمات غزالی'' اور ''افکار ابن خلدون'' ان کی معرکہ آراء تصانیف ہیں۔

عربی کی بعض خالص فنی کتابوں کو مولانا نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے جس انداز سے انہوں نے یہ خدمت انجام دی ہے، اس میں کوئی ان کا ثانی یا حریف نہیں ہے، انہوں نے فلسفہ و منطق کی پیچیدہ عربی عبارتوں کو اردو میں اس خوبصورت اسلوب میں منتقل کیا ہے کہ وہ اردو ادب کا بہت بڑا حصہ قرار پائی گئی ہیں اور ان علوم کی ثقیل اور بھاری بھرکم اصطلاحوں کو اس نہج سے اردو زبان میں استعمال کیا ہے کہ ان کی ثقالت ادب کی دلکش عبارتوں کا روپ دھار گئی ہے۔ مثلاً ''سرگزشت غزالی'' کے نام سے غزالی کی ''المنقذ من الضلال'' کا اردو ترجمہ ''تہافت الفلاسفہ'' کا ترجمہ ''قدیم یونانی فلسفہ'' کے نام سے ''مقاصد الفلاسفہ'' کا ترجمہ ''مسلمانوں کے عقائد وافکار'' کے نام سے، امام ابوالحسن اشعری کی ''مقالات الاسلامیین'' کی دو جلدوں کا ترجمہ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے اس مکتوب کا ترجمہ جو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے موضوع پر فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے اور جسے ''مکتوب مدنی'' کہا جاتا ہے،

یہ سب تراجم مولانا کے علمی شاہکار اور موضوع پر ان کے بے پناہ عبور پر دلالت کناں ہیں، مکتوب مدنی کے سوا مولانا نے ان میں سے ہر کتاب پر طویل مقدمہ سپرد قلم کیا ہے اور ہر کتاب کے مقدمے میں موضوع کتاب کی بھی وضاحت کی ہے، کتاب کے مندرجات کا پس منظر بھی بیان کیا ہے، بعض اصطلاحات کو بھی منقح کیا ہے، اس دور کے مسائل و حالات کی بھی توضیح کی ہے، یہ بھی بتایا ہے کہ مصنف نے یہ کتاب کیوں تصنیف کی نیز مصنف کے سوانح حیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خوش اسلوبی کے ساتھ ترجمے کے مراحل طے کرنا نہایت مشکل ہے اور اصل کتاب تصنیف کرنے سے یہ زیادہ دقت طلب کام ہے، مترجم کیلئے تین اوصاف کا حامل ہونا ضروری ہے:

اول! جس زبان میں کتاب لکھی گئی ہے، اس زبان سے وہ کامل آگاہی رکھتا ہو۔

ثانی! جس زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہے، اس پر اسے پورا عبور حاصل ہو۔

ثالث! کتاب جس موضوع پر مشتمل ہے، اس موضوع پر اس کی گرفت ہو۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ ان تینوں اوصاف سے متصف تھے، وہ دونوں زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے اور موضوع پر بھی ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ان کے پاس الفاظ کا وسیع ذخیرہ موجود تھا اور ان کے استعمال پر انہیں پوری قدرت حاصل تھی، ترجمے کے سلسلے میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اگر مصنف اسے اردو زبان میں لکھتا تو کس انداز اور کس اسلوب میں لکھتا۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ عام معاملات میں نہایت زندہ دل اور بے حد فراخ حوصلہ تھے اور صلح کل طبیعت کے مالک! لیکن منکرین حدیث اور مرزائیوں کے بارے میں ان کے احساسات بالکل دوسری قسم کے تھے علمی اور فکری اعتبار سے ان دونوں

گروہوں سے ایک لمحے کے لئے بھی نہ وہ ہم آہنگ ہو سکتے تھے اور نہ ان سے کسی صورت میں مصالحت کے قائل تھے۔ ان کا نام سنتے ہی ان کا لہجہ بدل جاتا تھا اور قلم کی رفتار میں تیزی آ جاتی تھی منکرین حدیث کے متعلق ان کے نقطہ نظر کی وضاحت ان کی تحریرات کی روشنی میں کسی دوسرے موقعے پر کی جائے گی، یہاں ہم صرف مرزائیت کے بارے میں اختصار کے ساتھ ان کا زاویہ فکر قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں...... لیکن اس سے پہلے چند الفاظ میں یہ بتانا ضروری ہے کہ مرزائیت کے موضوع پر اہل حدیث علمائے کرام نے کیا خدمات سرانجام دیں۔

مرزا صاحب پر کفر کا سب سے پہلا فتویٰ مشہور اہل حدیث عالم حضرت مولانا محمد حسین بٹالویؒ نے تیار کیا تھا اور اسے اپنے استاد عالی مرتبت حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کی خدمت میں پیش کر کے اس پر ان کے دستخط کرائے تھے، مرزا صاحب اور ان کے ساتھی اس سے نہایت پریشان ہوئے تھے اس لئے مولانا بٹالویؒ نے ہندوستان کے دور دراز مقامات میں رہنے والے دو سو معروف و ممتاز علمائے عظام سے خود مل کر یا اپنے نمائندے بھیج کر اس فتوے پر ان کے تائیدی دستخط کرائے تھے اور اس پر انہوں نے اپنی مہریں ثبت فرمائی تھیں۔ مرزا صاحب اور ان کے ساتھی اس فتوائے تکفیر سے نہایت پریشان ہوئے تھے، چنانچہ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

''علمائے پنجاب اور ہندوستان کی طرف سے فتنہ تکفیر و تکذیب حد سے گزر گیا ہے اور نہ صرف علماء بلکہ فقراء اور سجادہ نشیں بھی اس عاجز کے کافر اور کاذب ٹھہرانے میں مولویوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں، ان لوگوں کے اغواء سے ہزاروں لوگ ایسے پائے جاتے ہیں کہ وہ ہمیں نصاریٰ اور ہنود سے بھی اکفر سمجھتے ہیں اگرچہ اس تکفیر کا بوجھ نذیر حسین دہلوی کی گردن پر ہے مگر تاہم دوسرے مولویوں کا یہ گناہ ہے کہ

انہوں نے اس نازک امر تکفیر میں اپنی عقل اور اپنی تفتیش سے کام نہیں لیا بلکہ نذیر حسین کے دجالانہ فتوے کو دیکھ کر جو محمد حسین بٹالوی نے تیار کیا تھا، بغیر تحقیق کے ایمان لے آئے"

(انجام آتھم از مرزا غلام احمد قادیانی صفحہ 45 مطبوعہ 1897ء)

فتوائے تکفیر کے بارے میں مرزا صاحب کی یہ عبارت بالکل واضح ہے اور انہوں نے صاف لفظوں میں تحریر کیا ہے کہ ان کو کافر قرار دینے کا فتویٰ سب سے پہلے مولانا محمد حسین بٹالوی نے لکھا اور سب سے پہلے اس فتویٰ پر حضرت میاں سید نذیر حسین نے دستخط کئے اور ان کے دستخط دیکھ کر پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علماء اور سجادہ نشینوں نے بلکہ بقول مرزا صاحب کے وہ علماء و سجادہ نشین "اس فتوے کو دیکھ کر" اس پر "ایمان لے آئے ہیں"۔

اس فتوے کے سلسلے میں دوسری جگہ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

"مولوی محمد حسین نے یہ فتوی لکھا اور میاں نذیر حسین دہلوی سے کہا کہ سب سے پہلے اس پر مہر لگا دے اور میرے کفر کی بابت فتویٰ دے دے اور تمام مسلمانوں میں کافر ہونا شائع کر دے۔ سو اس فتوے اور میاں صاحب مذکور کی مہر سے بارہ برس پہلے یہ کتاب (براہین احمدیہ) تمام پنجاب اور ہندوستان میں شائع ہو چکی تھی اور مولوی محمد حسین جو بارہ برس بعد اول المکفرین بنے، بانی تکفیر کے وہی تھے اور اس آگ کو اپنی شہرت کی وجہ سے تمام ملک میں سلگانے والے میاں نذیر حسین دہلوی تھے"۔

(تحفہ گولڑویہ از مرزا قادیان۔ صفحہ 121 مطبوعہ قادیان 1914ء)

مرزا صاحب کے ان الفاظ نے بات بالکل صاف کر دی ہے کہ ان کی "تکفیر کے بانی" مولانا محمد حسینؒ تھے اور حضرت میاں صاحبؒ اس تکفیر کی "آگ کو اپنی شہرت کی وجہ سے تمام ملک میں سلگانے والے" تھے۔ یعنی حضرت میاں صاحبؒ

پورے ہندوستان کے علماء زعماء میں اپنا ایک علمی مقام اور شہرت رکھتے تھے، اس کی وجہ سے تمام ملک میں یہ فتویٰ پھیلا اور لوگوں نے مرزا صاحب کو اس فتوے کی بناء پر کافر قرار دیا۔

مرزا صاحب کے زمانے میں لدھیانہ وغیرہ کے بہت سے علمائے احناف موجود تھے لیکن انہوں نے اپنی ''تکفیر کے بانی'' اور ''اول المکفرین'' مولانا محمد حسین بٹالویؒ اور حضرت میاں نذیر حسین دہلویؒ ہی کو کہا ہے البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مساجد سے وہابیوں کو نکالنے (اخراج الوہابیین عن المساجد) کا فتویٰ لدھیانہ کے علمائے کرام نے جاری فرمایا تھا۔ اس دور میں جب کہ ہندوستان کی انگریزی حکومت وہابیوں کو باغی قرار دے کر وسیع پیمانے پر انہیں گرفتار کر رہی تھی، ان پر بغاوت کے مقدمے قائم کر کے انہیں سخت سے سخت سزائیں دے رہی تھی اور ان کی جائیدادیں ضبط کر کے انہیں کالے پانی بھیج رہی تھی، ان پر مسجدوں سے نکال دینے کے فتوے لگانا انتہائی معنی خیز بات تھی اس ''معنی خیزی'' کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ انشاء اللہ کسی اور مقام پر اس کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

علماء لدھیانہ کے دستخط

تکفیر مرزا کے سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ مولانا بٹالویؒ کے تیار کردہ فتوے پر ہی حضرت میاں صاحبؒ کے علاوہ دستخط کرنے والوں میں علمائے لدھیانہ بھی شامل ہیں اور ان کے دستخط اس طرح ہیں:

مشتاق احمد، نور محمد، عبدالقادر، قربان علی لکھنوی، محمد حسن رئیس وگروہ اہل حدیث لدھیانہ، نورالدین خاں (ملاحظہ ہو مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکار دائرہ

اسلام سے خارج ہیں۔''

(مرتبہ مولانا محمد حسین بٹالویؒ شائع کردہ دارالدعوۃ السّلفیہ، لاہور صفحہ 100)۔

اسی فتوے پر مولانا بٹالوی نے علمائے دیو بند اور سہارن پور کے دستخط کرائے، ان کے اسمائے گرامی ان کی تحریر فرمودہ عبارت کے نیچے اس طرح درج ہیں! حررہ خلیل احمد مدرس دوم مدرسہ عربی دیو بند، کتبہ عزیز الرحمٰن دیو بندی، العبد محمود دیو بندی معرفت مولوی محمد حسن صاحب، العبد رشید احمد گنگوہی، حررہ عبدالرحمٰن عفی عنہ، العبد محمود حسن عفی عنہ، حرہ محمد حسن عفی عنہ، احقر بشیر احمد، حررہ محمد جان علی عفی عنہ،

(حوالہ مذکور صفحہ 153 تا157)

یہ مولانا بٹالویؒ کی بہت بڑی خدمت ہے کہ انہوں نے فتوائے تکفیر تیار کیا اور پھر متحدہ ہندوستان کے مختلف بلا دو قصبات کے علمائے کرام کے اس پر دستخط کرائے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

فتوائے تکفیر کے علاوہ مولانا بٹالویؒ نے براہ راست مرزا صاحب سے مباحثہ بھی کیا، اسے مباہلے کی دعوت بھی دی اور اس کی تحریروں کا جواب بھی تحریری صورت میں دیا۔ بلاشبہ اس دور کے برصغیر کی جماعت علماء میں مولانا بٹالویؒ پہلے عالم تھے جنہوں نے مرزا قادیانی کے مقابلے میں محاذ کھولا اور ہر محاذ میں اسے شکست دی۔

مرزا صاحب کی تکفیر کے متعلق مولانا محمد حسین بٹالوی کے فتوے کے بعد، مختصر الفاظ میں، ہم حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ، کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا امرتسریؒ نے اس عہد میں جس انداز سے مرزائیت کا مقابلہ کیا اس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ تحریری، تقریری اور مناظرانہ رنگ میں ہر محاذ پر انہوں نے مرزائیوں کو للکارا۔ مرزا غلام احمد سے لے کر نیچے درجے کے مرزائی مبلغوں تک

انہوں نے نہایت جرأت سے ٹکر لی۔ کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ جب ان کے گورو گھنٹال (غلام احمد) سے پنجہ آزمائی کر چکے ہیں، تو ان چھوٹے درجے کے مبلغوں کو منہ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے ہمیشہ دینی اہمیت کو پیشِ نگاہ رکھا اور بڑے چھوٹے ہر مرزائی کا ہر موقعے پر تعاقب کیا۔

وہ پہلے عالمِ دین ہیں، جنہوں نے برسرِ عام مرزائیوں سے مناظرے کی طرح ڈالی۔ 1902ء میں مرزا صاحب نے ''اعجاز احمدی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کو چیلنج دیا کہ وہ قادیان آئیں اور میرے الہامات کو غلط ثابت کریں۔ ہر الہام کے بدلے انہیں سو روپے انعام دیا جائے گا۔ اگر وہ تمام الہامات غلط ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے کے انعام کے مستحق ہوں گے۔

مرزا صاحب کے چیلنج کے جواب میں 11 جنوری 1903ء کو مولاناؒ قادیان پہنچے اور مرزا صاحب کو مقابلے میں آنے کی دعوت دی لیکن وہ مقابلے میں نہیں آئے اور محمد احسن امروہوی کے ہاتھ رقعہ لکھ کر بھجوایا کہ وہ قسم کھا کر اللہ سے عہد کر چکے ہیں کہ وہ کسی سے مناظرہ نہیں کریں گے۔

یہ رقعہ پڑھ کر مولاناؒ نے قادیان میں تقریر کی اور مرزا صاحب کو ان کے گھر میں بار بار سامنے آنے کی دعوت دی لیکن وہ نہیں آئے۔

اعجاز احمدی 1902ء کے آخر میں چھپی تھی، اس کتاب میں مرزا صاحب نے مولانا امرتسریؒ کی فضیلتِ علمی کا بھی اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ ثناء اللہ کو مسلمانوں میں قبولیت کا مقام حاصل ہے۔

مرزا صاحب کا مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے اس پامردی اور تسلسل کے ساتھ پیچھا

کیا کہ وہ شدید گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا اور پکار اٹھا کہ جھوٹا سچے کی زندگی میں مر جائے۔ 15 اپریل 1907ء کو اس نے ''مولوی ثناء اللہ صاحب کے ساتھ آخری فیصلہ'' کے عنوان سے اشتہار شائع کیا اور اس سے تقریباً گیارہ مہینے بعد وہ 24 مئی 1908 کو احمد بلڈنگس لاہور میں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کے مکان پر ہیضے کی بیماری سے مر گیا۔ یہ اس کی واحد دعا یا بددعا تھی جو قبول ہوئی۔ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحبؒ نے اس سے چالیس برس بعد 15 مارچ 1948ء کو سرگودھا میں وفات پائی۔

یہاں یہ بھی سنتے جایئے کہ مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت کرنے سے پہلے ان کے عقائد و افکار سے مطلع ہو کر مولوی عبدالحق غزنویؒ سے ان کا مباہلہ ہوا تھا، جس کا نتیجہ مرزا صاحب کے خلاف نکلا۔

ان چند نہایت مختصر گذارشات کے بعد اس کتاب کی طرف آیئے جو ''مرزائیت نئے زاویوں سے'' کے نام سے ہمارے زیرِ مطالعہ ہے، یہ کتاب مولانا محمد حنیف ندویؒ کے بعض مضامین کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے ہفت روزہ الاعتصام میں اس کے ابتدائی دور 1950ء اور اس کے گردو پیش میں تحریر فرمائے تھے، مولانا نے نہایت علمی انداز میں مرزائیت کو موضوعِ بحث ٹھہرایا ہے۔ اس کتاب میں جہاں اور بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں ایک انتہائی اہم بات یہ معرض بیان میں لائی گئی ہے کہ پاکستان میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ بلکہ کہا گیا ہے کہ خود مرزائیوں کو حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ انہیں اقلیت کا درجہ دیا جائے۔ اس سے قبل مرزائیوں کو کافر تو سب مسلمانوں نے قرار دیا تھا لیکن انہیں حکومت سے اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کسی نے نہیں کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اسلامی جماعتوں میں سب سے پہلے یہ آواز مولانا محمد حنیف ندویؒ نے بلند کی اور ''الاعتصام'' میں اس موضوع پر مدلل مضامین

سپرد قلم فرمائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ جس طرح مرزا صاحب کے لئے سب سے پہلے تکفیر کا فتویٰ اہل حدیث عالم مولانا محمد حسین بٹالویؒ نے تیار کیا تھا، اسی طرح امتِ مرزائیہ کو پاکستان میں اقلیت قرار دینے کی آواز سب سے پہلے مولانا محمد حنیف ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بلند کی جو کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

مولانا نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں جس زمانے میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک کی تھی، اس زمانے میں چوہدری ظفر اللہ پاکستان کی وزارت خارجہ کے منصب پر فائز تھے اور سب کو معلوم ہے کہ وہ مرزائی تھے مولانا مرزائیوں کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

''چوہدری ظفر اللہ کے موجودہ اثر و رسوخ سے الگ ہو کر انہیں سوچنا چاہئے کہ ان کا حقیقی فائدہ کس بات میں مضمر ہے؟ کیوں کہ جلد یا بدیر چوہدری ظفر اللہ کا یہ اثر بہر آئینہ ان سے چھننے والا ہے، انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ بڑی سے بڑی ملازمتیں بھی کسی گروہ کے لئے کوئی تحفظ نہیں ہوتیں۔ حقیقی تحفظ یہ ہے کہ پاکستان کے دستور میں ان کے لئے مخصوص اقلیت کی حیثیت سے جگہ ہو''۔

اس سے آگے مولانا فرماتے ہیں:

''ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ انہیں ایک اقلیت سمجھیں اور ان سے اسی طرح کا برتاؤ کریں، جس طرح کا اقلیت سے کرنا چاہئے۔ لیکن ہم اس پر آمادہ نہیں ہیں کہ انہیں اسلام کے نام پر ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع دیں''۔

''آئندہ دستور میں مرزائیوں کی جگہ'' کے عنوان سے مولانا نے زیر نظر کتاب میں مرزائیوں کے عقائد و تصورات کا ذکر نہایت خوبصورت الفاظ میں کیا ہے، ان کے عقائد و تصورات کی روشنی میں مولانا رقم فرماتے ہیں:

''ہماری رائے میں خود قادیانیوں کو اس بات پر اصرار نہیں کرنا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کی ایک شاخ ہیں۔ وہ عام مسلمانوں کے ساتھ رشتے داری کو ممنوع گردانتے ہیں، ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور ان کے جنازوں میں شریک نہیں ہوتے، لہذا خود ان کیلئے یہی مناسب ہے کہ یہ ایک الگ قوم کی حیثیت سے پاکستان میں رہیں...... اقلیت کی یہ رعایت بھی ان کے لئے بس ایک ناگزیر رعایت ہے، جو حالات کی مجبوریوں سے دی گئی ہے ورنہ خالص اسلامی طرز عمل تو وہی ہے، جو حضرت ابوبکرؓ نے مرتدین کے مقابلے میں اختیار کیا۔''

1952ء کے آخر میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک پاکستان میں چلی تھی، جس میں ملک کی تمام مذہبی جماعتوں نے حصہ لیا تھا اور اس کے نتیجے میں حکومت پاکستان نے بے شمار لوگوں کو گرفتار کرلیا تھا، گرفتار شدگان میں علمائے کرام بھی بہت بڑی تعداد میں تھے۔ لیکن اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام اور عوام کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ بعض مقامات کے تمام اہل حدیث باشندوں کو گرفتار کرلیا گیا تھا، ملک کے متعدد دیہات میں صرف اہل حدیث مسلک کے حاملین آباد ہیں، ان سب کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ مثلاً ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑانوالہ کے چک نمبر 23 گ ب کے تمام اہل حدیث حضرات کو گرفتار کرلیا گیا تھا اور میں فیصل آباد جیل میں ان سے ملاقات کے لئے گیا، تو اس دور کے سپریٹنڈنٹ جیل کی ہدایت پر جیل کا ایک افسران لوگوں سے ملاقات کے لے مجھے جیل کے اندر لے گیا تھا اور میں انہیں دیکھ کر نہایت متحیر ہوا کہ گاؤں کے تمام اہل حدیث جیل میں بند ہیں۔ یہ سب لوگ میرے رشتے دار تھے، اسی طرح خود میرے گاؤں چک نمبر 53 گ ب منصور پور (تحصیل جڑانوالہ) کے بہت سے لوگوں کو پکڑ

لیا گیا تھا، اس دور کے لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کی جامع مسجد میں وہ لوگ کثیر تعداد میں جمع ہو گئے تھے، جو اس تحریک میں اپنے آپ کو گرفتار کرانے کے خواہاں تھے، ان کا انتظام اہل حدیث عالم مولانا علی محمد صمصامؒ اور مجلس احرار کے رہنما قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ کے سپرد تھا۔ اسی طرح 1974ء میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک جاری ہوئی، تو اس میں بھی بے شمار اہل حدیث حضرات نے حصہ لیا اور اس تحریک کو کامیاب کرنے کیلئے میدانِ عمل میں نکلے اور یہ تحریک کامیاب ہوئی، اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو تھے، انہوں نے مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم کیا اور مرزائیوں کو کافر قرار دے کر اقلیتوں کی فہرست میں شامل کیا۔

یہ ایک نہایت تاریخی مسئلہ ہے، جسے قلم و قرطاس سے تعلق رکھنے والے اہل حدیث حضرات کو مرکز موضوع بنانا چاہئے اور اس باب میں اپنی اور اپنے بزرگوں کی خدمات کا تفصیل سے ذکر کرنا چاہئے۔ یاد رہے کوئی دوسرا کسی کے کارناموں کو بے شک وہ کتنی بڑی اہمیت کے حامل ہوں، بیان نہیں کرتا اپنی بات خود بیان کرنا چاہئے اور اپنے کارناموں سے جو خالص دینی یا سیاسی نوعیت کے ہیں، موجودہ اور آنے والی نسلوں کو مطلع کرنا چاہئے۔ جو لوگ انکسار سے کام لیتے ہیں اور بات ظاہر کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں، وہ تاریخ کو چھپاتے ہیں اور صحیح واقعات پر پردہ ڈالنے کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اب مرزائیوں کے سلسلے میں اہل حدیث کی اوّلیات ملاحظہ فرمائیے:

☆ مرزا غلام احمد پر تکفیر کا فتویٰ سب سے پہلے حضرت مولانا محمد حسین بٹالویؒ نے تیار کیا اور اس پر اپنے استاذ عالی قدر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلویؒ کے دستخط کرائے اور پھر پنجاب و ہندوستان کے تقریباً دو سو مشاہیر علماء کرام کی خدمت میں اس

فتوے کا مضمون پیش کیا اور ان سے اس طرح اس کی تصویب وتصدیق کرائی کہ انہوں نے اس پر دستخط ثبت فرمائے یا اپنی مہریں لگائیں۔

☆ مرزا صاحب سے مقابلے کے لئے سب سے پہلے عالم جو قادیان گئے، وہ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ تھے، یہ جنوری 1903ء کا واقعہ ہے، انہوں نے مرزا صاحب کے گھر جا کر انہیں للکارا، لیکن مرزا صاحب مقابلے کے لئے نہیں نکلے۔

☆ مرزائیوں سے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ سب سے پہلے مولانا محمد حسین بٹالویؒ اور مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے شروع کیا۔

☆ جس تعداد میں مولانا ثناء اللہ صاحبؒ نے مرزائیوں سے مناظرے کئے اس تعداد میں کسی نے نہیں کیے۔

☆ مسلمانانِ برصغیر کی طرف سے ''فاتح قادیان'' کا لقب مولانا ثناء اللہؒ ہی کو دیا گیا۔

☆ مرزا صاحب کو مباہلے کا چیلنج سب سے پہلے اہل حدیث علمائے کرام نے دیا۔

☆ مرزائیت کے خلاف سب سے زیادہ کتابیں اہل حدیث مصنفین نے لکھیں۔

☆ قیامِ پاکستان کے بعد ملک کے دستور میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ تحریری صورت میں سب سے پہلے اہل حدیث عالم مولانا محمد حنیف ندویؒ نے کیا، بلکہ مرزائیوں کو توجہ دلائی کہ وہ خود حکومت سے مطالبہ کریں کہ انہیں ملک کے دستور میں اقلیت کا مقام دیا جائے تاکہ ان کی مخالفت

میں روز بروز کا سلسلہ ختم ہو جائے۔

☆ مرزائیت کے خلاف جتنی تحریکیں چلیں، ان میں سب سے زیادہ اہل حدیث علماء اور عوام نے حصہ لیا اور اس کے نتیجے میں حکومت نے انہیں گرفتار کیا۔

آخر میں یہ عرض کر دیں کہ یہ کتاب جو مرزائیت نئے زاویوں سے" کے نام سے قارئین کرام کے زیر مطالعہ ہے، پہلی دفعہ فروری 1953ء میں شائع ہوئی تھی اور چند روز میں ختم ہو گئی تھی، اب یہ نایاب تھی، اس کا نام بھی ادبیت کا پہلو لئے ہوئے ہے اور اس کے مندرجات میں بھی علم وفکر اور ادب و انشاء کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ مرزائی علم کلام اور اس کے ذہنی و عملی نقطہ نظر کی پوری تصویر اس میں کھینچ دی گئی ہے۔

"طارق اکیڈمی" مبارک باد کی مستحق ہے، جس نے اس نایاب علمی ذخیرے کو اڑتالیس برس بعد شائقین کے علم ومطالعہ میں لانے کا عزم کیا۔

ہماری دعاء ہے اللہ تعالی اس کتاب کے مصنف کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، طارق اکیڈمی کے اربابِ انتظام کو علم و ادب کی خدمت کے مواقع فراہم فرمائے اور قارئینِ محترم کو اس کتاب سے استفادہ کی توفیق سے نوازے۔

محمد اسحاق بھٹی
اسلامیہ کالونی سانده لاہور
8 صفر 1421ھ 13 مئی 2000ء

ابتدائیہ

ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو مرزائیت کو اس کے سوا اور کوئی اہمیت نہیں دیتے کہ وہ ایک فتنہ تھا، جواب ختم ہو چکا۔ کیونکہ ان حالات میں جبکہ پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے، اس کو بالکل نئے قسم کے مسائل کا سامنا ہے، ایسے مسائل جو پوری دنیا کو پریشان کئے ہوئے ہیں مرزائیت کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کبھی کوئی جواب نہ تھا۔

یہ پہلے پہل محض ایک غلط فہمی تھی۔ اس کے بعد اس نے مناظرانہ ادعاء کی شکل اختیار کر لی۔ اور پھر جب انگریز کی چشم دور رس نے اس میں اپنے استعماری عزائم کی محکمی واستواری کے امکانات دیکھ کر سر پرستی کی اور منصب واعزاز کے متعدد دروازوں کو اس پر کھول دیا تو باقاعدہ ایک جماعت اور گروہ کا روپ دھار لیا جس نے از راہِ اخلاص متحدہ ہندوستان اور اسلامی ممالک میں، تبلیغ کے رنگ میں برطانیہ کے سیاسی ارادوں کی تکمیل کے سلسلہ میں وہ کام کر دکھایا، جو عیسائی مشنری ہزاروں صلاحیتوں کے باوجود نہیں کر سکتے تھے۔ یعنی مسلمانوں کی اس عصبیت و جوش پر تیر چلانے کی کوشش کی جو ان کو جہاد پر اکسا سکتا تھا۔ اور انگریز کے خلاف آمادۂ پیکار رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں اس شرارت کا ایک فائدہ انگریز کو یہ پہنچا کہ مسلمان وقت کی صحت مند تحریکوں کا

ساتھ دینے اور ان دینی وثقافتی مضرتوں پر غور کرنے کے بجائے جو انگریز کی آمد آمد سے ان کو پہنچی تھیں لاطائل مناظرات ومجادلات میں الجھ گئے۔

بحمد للہ انگریز کا یہ منحوس سایہ مرزائیت کی تائید وحمایت کے علی الرغم اب سروں سے اٹھ چکا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ فتنے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں جارہے ہیں۔ جو صرف اس کی نگرانی وحوصلہ افزائی کی وجہ سے زندہ تھے۔لہذا اس امر کا اب کوئی حقیقی امکان نہیں رہا کہ مرزائیت آئندہ پروان چڑھے گی۔نوجوانوں میں پھیلے گی اور اپنی دعوت کے دائروں کو وسیع کر پائے گی۔ کیونکہ اس نوع کا خطرہ کسی تحریک سے اس وقت ہوتا ہے جب اس میں علمی گہرائیاں ہوں، ایجابی پیغام ہوں۔ اور ایسے تصورات ہوں، جن کا زندگی سے گہرا لگاؤ ہو یا پھر بدرجہء اقل تحریک کے حاملین میں اچھے نمونے پائے جائیں۔مگر یہاں تو یہ عالم ہے کہ یہ تینوں چیزیں مفقود ہیں، وہ نہ تو اپنی تہوں میں کوئی اونچا نصب العین ہی رکھتی ہے، نہ اس کی تعلیمات میں زندگی کی موجودہ اقدار سے بحث کی گئی ہے،اور نہ اس کے ماننے والوں میں کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے، جو سیرت وکردار کے لحاظ سے کشش اور جذب سے بہرمندہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ اگر مرزائیت ایسا ہی حقیر فتنہ ہے اور اس کا دور فی الواقعہ گزر چکا ہے تو ہم نے ''الاعتصام'' میں اس کے بارہ میں خواہ مخواہ کیوں مضامین لکھے،اور کیوں بغیر کسی غرض ومقصد کے اب ان کو کتاب کی شکل میں شائع کیا جارہا ہے،اس اعتراض کے ہمارے پاس دو جواب ہیں۔

(۱)۔اس لئے کہ دینی وعلمی اعتبار سے اگرچہ مرزائیت کے لئے مستقبل میں کوئی جگہ نہیں اور یہ مذہب اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکا ہے تاہم سیاسیات کی نئی کروٹوں نے ایک پیچیدگی ضرور پیدا کردی ہے اور وہ یہ کہ اس مسلک کو ماننے والے ایک معقول تعداد

میں پاکستان میں موجود ہیں۔ اور بظاہر پاکستان کے شہری بھی ہیں لیکن ان کی سابقہ روایات، ان کا بے لوث عقیدہ اور قادیان کا بھارت میں رہ جانا ایسے امور ہیں کہ ان کے پیش نظر اگر ان کی حیثیت و موقف سے متعلق ٹھیک ٹھیک فیصلہ نہ کیا گیا تو یہ پاکستان اور بھارت کی جنگ کی صورت میں خدانخواستہ سخت مضر ثابت ہو سکتے ہیں۔[1]
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم جنگ نہیں چاہتے اور بھارت کی اکثریت بھی اس کی خواہاں نہیں لیکن کوئی ملک بھی آج جنگ کو بالکل نظر انداز کر ے آئین کے بوقلموں تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا

''الاعتصام'' کے شائع شدہ مضامین میں ہم نے ان کے اس موقف کی تشریح کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ آئندہ آئین میں اگر انہیں اقلیت قرار دیا جائے تو اس پیچیدگی کا

---

[1] اس عظیم مفکر کا یہ خدشہ بالآخر درست ثابت ہوا، 1965 کی جنگ کے احوال وکوائف سے دستاویزی ثبوت مل گئے۔ چونڈہ سیکٹر بالخصوص پاک بھارت جنگ آغاز سے لے کر شملہ معاہدہ تک کی پوری تاریخ دیکھ جائیے۔ اس دور کے روزنامہ الفضل و دیگر قادیانی جرائد کی فائلیں ان تمام شواہد کی گواہ ہیں۔
65ء کی جنگ میں قادیانیوں نے کیا کیا سازشیں کیں پنجاب وکشمیر پر مشتمل قادیانی ریاست کی تشکیل اور اس کے لئے اس جنگ میں قادیانی فوجی افسروں کی ''قربانیوں'' نے باہم ثبوت مہیا کئے۔
اور اس کے بعد 71ء کی جنگ مشرقی پاکستان میں قادیانیوں کی سازشوں کا پورا جال، جس کے نتیجہ میں...... سقوطِ مشرقی پاکستان اور کم وبیش ایک لاکھ فوجی وسول نفری کا ''جنگی قیدی'' بنا اب محض الزام نہیں نا قابل تردید حقائق ہیں اور یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ ان دونوں مواقع پر ظاہری طور پر اور پوشیدہ۔ ہیرو بھٹو تھا۔ اور اس کے مشیر ''مہربان'' قادیانی تھے۔
مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے انہی مضمرات کی طرف اشارہ کیا تھا جو ان کی خداداد بصیرت کا مظہر تھا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃ ونور اللہ ضریحہ وعلی برکات اللہ علیہ، (اس کی تفصیلات ہماری زیر طبع کتاب ''قادیانیوں کے سیاسی عزائم'' میں ملاحظہ فرمائیں۔ خالد اشرف

حل نکل آتا ہے یہ مجموعہ انہیں مضامین پر مشتمل ہے۔

(۲) اس سبب سے بھی اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اب تک جو بحثیں اس پر ہو رہی تھیں ان کا انداز بالکل مناظرانہ اور سطحی قسم کا تھا جو باوجود تردید کے وہی ذہن پیدا کرتا تھا جو مرزائیت کا ہے ہم نے اس صورت حال کا جائزہ لیا اور کچھ نئے زاویوں سے اس مسئلہ پر نظر ڈالی اور بحث وفکر کی جدید روش نکالی جس سے قارئین کرام تمام مفسدوں سے بچ کر صحیح نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔ جو اتھلے مناظرانہ انداز بحث سے ابھرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مرزائیت ایک خاص طرز استدلال کا نام ہے مخصوص عقیدوں کا نہیں۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ دیکھنے میں ایک شخص ان کی تردید میں دلائل کا انبار لگا رہا ہو۔ لیکن فی الحقیقت اس کے باوجود ذہن کی ''کیفیتوں'' کے اعتبار سے اس میں اور مرزائیت میں کوئی فرق نہ ہو۔ ان مضامین کا مقصد اس مرزائیت سے اس کے حامیوں اور مخالفوں کو نکالنا ہے اور دونوں کو یہ بتانا ہے کہ نبوت والہام کے تقاضے تائید وتردید کے فرسودہ اسالیب سے قطعی مختلف اور غیر مفید ہیں۔

ہمارے نزدیک اول تو اسلام ہماری تمام ضروریات کا کفیل ہے، اور اس کے مضمرات میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی عصرِ حاضر کو ضرورت ہے اور تعلیم وارشاد کے داعیات نے اگر کسی وقت جبریلؑ کو پکار ہی لیا تو اس وقت ظل وبروز سے کام نہیں چلے گا بلکہ ایک ایسی شریعت کے دروازے کھلیں گے جو ہر اعتبار سے نئی ہوگی۔ جن لوگوں کو دورِ حاضر کی دینی نفسیات کو ٹٹولنے کا موقع ملا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ اس وقت کا انسان مذہب کے معاملہ میں کس اضطراب میں مبتلا ہے وہ یا تو اسلام کی ایسی جچی تلی تعبیر کا طالب ہے، جو حددرجہ مختصر ہو، معقول ہو، اور موجودہ عصر کے تمام تقاضوں کا باحسن وجہ ساتھ دے سکے اور یا پھر وہ ایسے مذہب کو مانے گا جو بنیادی واساسی

اقدار کے لحاظ سے تو ماضی سے ایک رشتہ ونسبت رکھتا ہو، مگر اپنے اسلوب، تیقن، اور اخلاق کے اعتبار سے بالکل ہی نئی شئے ہو۔

آپ ہی بتلائیے۔ جب ذہنوں کی یہ کیفیت ہو اور تشنگی وطلب کا یہ عالم ہو تو شراب سے پیاس بجھ سکے گی؟ نبوت کے ظلی و بروزی تصور سے پیش آیندہ مسائل کا حل ڈھونڈا جا سکے گا؟

''مرزائیت نئے زاویوں سے'' ایسے ہی تنقیدی مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ یہ تصور جس کو مرزا صاحب نے پیش کیا ہے، نہایت ہی گھٹیا، غیر حکیمانہ اور بیکار ہے۔ اس سے مذہب و دین کا کوئی تقاضا پورا نہیں ہو پاتا۔ اور اس سے سوا قیل وقال اور چند حوالوں اور مناظرانہ ہتھکنڈوں کے اور کچھ حاصل نہیں۔ اس سے نہ ذہن کو فلسفہ کی بلندیاں میسر آتی ہیں، نہ ذوق میں ادب ولسان کی چاشنی کا اضافہ ہوتا ہے، اور نہ عمل ہی کو نئی سمتیں ملتی ہیں۔

ہم امید رکھتے ہیں کہ اس سے ان لوگوں کو بہت فائدہ پہنچے گا جو غلط فہمی سے مرزائیت کا شکار ہو گئے ہیں۔

محمد حنیف ندوی

(رحمتہ اللہ علیہ)



پیش لفظ

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

مرزا غلام احمد صاحب اپنے ایک رسالے میں موٹے حروف میں لکھتے ہیں کہ ''گورنمنٹ برطانیہ کی اطاعت عین عبادت ہے'' غالبًا اسی وجہ سے ان کو بعض حضرات نے ''سرکاری نبی'' کا خطاب دیا ہے۔ پنجاب سائیکل مارٹ لکھنؤ کے ایک کرم فرمانے دورانِ گفتگو میں فرمایا کہ آیت اطیعو اللہ و اطیعوالرسول و اولی الامرمنکم میں منکم کے معنی علیکم ہے۔ یعنی تمہارا جو حاکمِ وقت ہو، اس کی اطاعت کرو۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے، جب تحریکِ ترکِ موالات اپنی شباب پر تھی۔ یہ ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے، جب میں ندوۃ العلماء میں طالب علم تھا اس کے بعد ۳۵۔۳۶ء کا ذکر ہے، کہ ایک مبلغ میرے پاس تبلیغِ غلامِ احمدیت کے لئے آیا اسے یہ خیال تھا کہ اگر کپور تھلے کی شاہی مسجد کا خطیب غلامِ احمدیت کو قبول کر لے تو نصف آبادی کپورتھلہ تو ضرور ہی حلقہء دام میں آ جائے گی۔ اثنائے گفتگو میں میں نے مرزا صاحب کی اس مندرج بالا عبارت کا حوالہ دیتے ہوئے پوچھا کہ ''کیا ہر حکومتِ وقت کی اطاعت عین عبادت ہے؟ جواب ملا ''بے شک'' میں نے پھر دریافت کیا ''اگر اس وقت برطانیہ کی بجائے فرعون، نمرود، ہامان، شداد وغیرہ کی حکومت ہو، تو آپ اس حکومت کی اطاعت کو بھی اپنی عین عبادت تصور فرمائیں گے؟ جواب ملا یقیناً۔ مجھے

اس یقیناً پر کوئی خاص تعجب نہ ہوا۔ کیونکہ وہ رسالہ جس میں مرزا صاحب کی مندرجہ بالا عبارت تھی، انہی مبلغ صاحب نے مجھے عنایت فرمایا تھا۔ اس رسالے کا نام ''القول الصحیح فی نزول المسیح'' یا اسی قسم کا کچھ نام تھا کچھ دنوں بعد میرزا بشیر الدین محمود صاحب کی ''تفسیر کبیر'' دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس میں سورۂ یوسف کی تفسیر میں آپ نے استدلال فرمایا ہے کہ ''مسلمان کے لئے حکومتِ کافرہ کی ملازمت، وفاداری اور اطاعت جائز ہی نہیں بلکہ سنتِ انبیاء ہے، جیسا کہ سیدنا یوسف کے طرزِ عمل سے واضح ہوتا ہے۔'' (یہ الفاظ میرے اور مضمون صاحب تفسیر کبیر کا ہے) ''یہ سرکاری امام رازی'' صاحب تفسیر کبیر وہی بزرگ ہیں جو اپنے ایک کتابچے میں تحریر فرماتے ہیں کہ'' میں نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر دو فرشتوں سے پڑھی ہے۔'' ''یہ سرکاری فرشتے'' اگر ٹیچی ٹیچی نہیں تو مجھے اس کا علم نہیں۔

باتیں تو اور بھی بے شمار ہیں۔ میں نے چند حوالوں پر صرف اس لئے اکتفا کیا ہے کہ آپ کو بیک نظر معلوم ہو جائے کہ ''غلام احمدی مذہب'' کی اصل بنیاد کیا ہے؟ آپ پر یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ اس کا لبِ لباب ہے ''ہر حکومتِ وقت کی اطاعت کو عین عبادت جاننا''۔ یعنی اگر ابراہیمؑ کی ٹکر ہو تو نمرود کی اطاعت کو ایمان سمجھو اور ابرہیمؑ کو شہر بدر کر دو۔

اگر موسیٰؑ و فرعون کا تصادم ہو تو فرعون کی وفاداری کو عبادت تصور کرو اور موسیٰؑ سے مقابلہ کرو۔

اگر زکریاؑ و ہیروڈیس کا مقابلہ ہو تو ہیروڈیس کا ساتھ دو، اور زکریاؑ کا سر قلم کر دو۔

اگر آنحضرت ﷺ اور کفارِ قریش سے جنگ ہو تو مکے کے رہنے والے غلام احمدی

وہی کریں جس کی میرزا صاحب نے تعلیم فرمائی ہے۔

اور اگر پاکستان و بھارت کی جنگ شروع ہو جائے تو بھارت کے غلام احمدی پورے خلوص و وفاداری کے ساتھ بھارتی فوج میں شامل ہو کر اپنے خلیفہ کے مقابلہ میں صف آرا ہوں۔ اور خلیفہ صاحب پاکستان کی وفاداری میں اپنے مریدانِ باصفا کا صفایا کریں۔ اور جسے فتح ہو وہ اسی طرح چراغاں کرے جس طرح عراق پر برطانوی قبضہ ہونے کے بعد قادیان میں چراغاں کیا گیا تھا۔

اور پھر مرزا صاحب کی روح پکار اٹھے قتلا هما فی الجنة تم دونوں نے واقعی ہمارے مشن کی تکمیل کی اور اپنی حکومتِ وقت کی اطاعت و وفاداری کر کے عین عبادت کا ثبوت بہم پہنچا دیا۔ تم دونوں جن وانس نے مقصدِ تخلیق کو پورا کیا۔ و مـــا خلقت الجن و الانس الا لیعبدون ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند، کتنا پاکیزہ عشق ہے۔

فرمائیے! میں نے غلط کہا ہے کہ پاکستان بنتے ہی غلام احمدیت ختم ہو گئی۔ جو مشن اصولاً ختم ہو جائے اسے جماعۃً بھی ختم ہی سمجھئے۔ ایسی جماعتیں افاقۃ الموت کے ئی سنبھالے لینے کی مہلت بھی حاصل کر لیں تو وہ درحقیقت مردہ ہی ہوتی ہیں۔ صرف اس لئے کہ ان کا اصول مردہ ہوتا ہے ورنہ محض زندگی تو چوپایوں کو بھی حاصل ہے۔ غلام احمدی جماعت کی زندگی صرف برطانیہ کے بل بوتے پر قائم تھی۔ مرزا غلام احمد صاحب نے فرمایا تھا کہ ''برطانیہ ہماری تلوار ہے'' ظاہر ہے وہ تلوار ہے جس کے سہارے وہ قائم تھے رخصت یا منتقل ہو گئی تو غلام احمدیت کس طرح زندہ رہ سکتی ہے؟

''وہ کون جو بگڑی ہوئی تقدیر سنوارے''

ایسے پھسپھسے، بے ثبات، بے مغز اور پادر ہوا اصول پر جس جماعت کی بنیاد ہو

اس کے افراد سے ''ختم نبوت'' اور دوسرے علمی مضمونوں پر مباحثہ کرنا میرے نزدیک تضیع اوقات ہے۔ پہلے انہیں نفسِ ''نبوت'' سمجھایئے کہ نبوت کیا چیز ہے؟ کس لئے ہوتی ہے، اس کا کیا مشن ہوتا ہے؟ پھر ختمِ نبوت پر گفتگو کیجئے۔ اور دیگر مضامین کی طرف توجہ دلایئے۔ جس کے مغز میں نبوت کا مشن ''برطانیہ (یا ہر حکومتِ وقت) کی اطاعت عین عبادت'' ہو، اس سے پہلے نفسِ نبوت پر بات کرنی ہے تو اس پر کیجئے کہ تم اصولاً ختم ہو چکے ہو، یا اس پر گفتگو ہونا چاہئے، کہ خود احمدیت زندہ ہے یا نہیں؟

آپ پوچھیں گے کہ جب یہ فرقہ ایسا ہی ناقابل اعتنا ہے؟ اور یہ ختم ہی ہو رہا ہے تو مولانا محمد حنیف ندوی نے یہ کتاب کیوں شائع کی ہے؟ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ غلام احمدیوں کو قابل تعرض سمجھتے ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ بعض سادہ لوح مسلمانوں کو ہوشیار کرنا ہے، غلام احمدی جماعت کا لٹریچر اور ان کے مبلغین بعض اوقات سادہ لوح مسلمانوں کو اس مسئلے پر گفتگو کرتے وقت چند مغالطوں میں ڈال دیا کرتے ہیں ان ہی مغالطوں سے ہشیار کرنا کتاب کا اصل مقصد ہے۔

انشاء اللہ یہ کتاب غلام احمدی جماعت کے سمجھدار طبقے کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہے گی۔ اس کتاب میں مؤلف نے ان تمام مضامین کو جمع کر دیا ہے، جو وقتاً فوقتاً ''الاعتصام'' میں شائع ہوتے رہے اور مقبول ہوئے۔ مولانا نے اپنی تحریر میں عام مناظرانہ انداز سے احتراز کیا ہے اور جن جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اس کا انداز نرالہ اور اچھوتا ہے۔ استدلال پرزور، مزاج سنجیدہ، گرفت مضبوط اور حملہ زوردار ہے۔ نگارش کے متعلق میں خود کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔

الفضل ما شهدت به الاعداء کی مثل الفضل نے پوری کر دکھائی ہے۔ مدیر الفضل جناب تنویر صاحب اس فضل کا اعتراف فرما چکے ہیں۔

ایک اور بات سن لیجئے۔ پاکستانی اور بھارتی غلام احمدیوں کی باہمی جنگ (بہ سلسلہ وفاداریٔ حکومتِ وقت) کا جو ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس کے متعلق ممکن ہے کوئی غلام احمدی آپ کو یہ کہہ کر مغالطے میں ڈالے کہ:

(۱) اگر افغانستان و پاکستان میں خدانخواستہ جنگ ہو جاوے، تو دونوں طرف مسلمان ایک دوسرے کے خلاف لڑیں گے یا نہیں؟

(۲) عائشہؓ اور علیؓ کی فوجیں باہم برسرِ پیکار ہوئیں یا نہیں؟

(۳) اگر ہندوستان و پاکستان کی جنگ ہو تو دونوں طرف کے مسلمان فوجی ایک دوسرے پر گولی چلائیں گے یا نہیں؟

بس اسی طرح سمجھ لیجئے کہ دونوں کے غلام احمدی بھی باہم ایک دوسرے کا گلا کاٹیں گے۔

بظاہر یہ اعتراض بڑا وزنی اور سادہ لوح مسلمانوں کو تذبذب میں ڈالنے والا نظر آئے گا۔ لیکن خوب سمجھ لیجئے، یہ ساری گفتگو ان کے دوسرے تمام مغالطوں کی طرح محض فریب ہوگا، اس لئے کہ:

اگر دو مسلمان گروہ یا حکومتیں باہم دست و گریبان ہوں تو گو ایک ہی عنداللہ برسرِ حق اور دوسری برسرِ ناحق ہوگی لیکن دونوں اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر نبرد آزما ہوں گی۔ کفر کی تائید کسی کے بھی پیش نظر نہ ہوگی۔ کفر کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے جنگ کرنے والا صرف کافر ہے اور کچھ نہیں۔

اور اگر قوتِ کافرہ اور طاقتِ مسلمہ کی ٹکر میں دونوں مسلمان ہوں تو قوتِ کافرہ کی تائید اور تغلب علی المسلمین کے لئے جنگ کرنے والے مسلمان نہیں کہے جا سکتے۔ اگر کوئی سیاسی مصلحت یا مجبوری ان کے پیش نظر ہو جب بھی وہ فتوائے فسق سے بچ نہیں

سکتے۔ برطانیہ کی تائید کے لئے ممالکِ اسلامیہ پر حملہ کرنے والے فوجی مسلمان جس فتویٰ کے مستحق تھے، اسی فتویٰ کے مستحق وہ فوجی مسلمان ہوں گے، جو نہرو کی تائید میں پاکستان سے جنگ کریں۔

اوران تمام باتوں کو جانے دیجئے۔ اسی قسم کے بھارتی فوجی مسلمانوں کے متعلق آپ اپنی بقا، مصلحت کوشی، تمنائے عہدہ و منصب فاسقانہ خودغرضی، کافرانہ تقیہ، قوم فروشی، خودفراموشی وغیرہ کے سارے الزام لگا لیجئے لیکن یہ کسی کے وہم و قیاس میں ہی نہیں آ سکتا کہ وہ نادان مسلمان پاکستانی مسلمانوں سے اس لئے جنگ کریں گے کہ ان کے پیغمبر ﷺ کا (نعوذ باللہ) یہ ارشاد ہے کہ نہرو گورنمنٹ کی اطاعت عین عبادت ہے۔ ایک بدتر سے بدتر مسلمان بھی کسی ایسی ''وحی'' کا قائل نہیں جس کا معنی ہر حکومتِ وقت کی اطاعت کو عین عبادت سمجھنا ہو وہ حکومتِ کافرہ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے الہامی فرامین غلام احمدی بارگاہ ہی سے صادر ہو سکتے ہیں جن میں حکومت اسلامیہ کی ماتحتی و تائید میں جنگ کرنے والے اور حکومت کافرہ کی ماتحتی و تائید میں جان دینے والے یکساں عبادت کا درجہ رکھتے ہوں۔

آخر میں ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی اس کاوشِ فکری سے، غلام احمدیت کا پڑھا لکھا طبقہ متاثر ہو، اور اس پر یہ واضح ہو جائے، کہ نبوت کا مقام بہت اونچا ہے، اور مرزا غلام احمد صاحب اس کے مقابلہ میں کوئی درجہ نہیں رکھتے۔

محمد جعفر شاہ پھلواروی

کیا یہی نبوت ہے؟

اس صدی میں جب ایک شخص ادعائے نبوت کے ساتھ ہمارے سامنے آئے گا اور قرآن کے اس معیار کے بعد آئے گا تو لامحالہ ہم سب سے پہلے اسی پیمانے سے اسے جانچیں گے۔ ہماری کم سے کم توقعات اس سے جو ہوں گی وہ یہ ہوں گی کہ اس نے اگرچہ قوم کے سامنے کوئی لائحہ عمل نہیں رکھا، زمانے کے مسائل کو نہیں سمجھا، موجودہ تقاضوں پر نظر نہیں ڈالی، سیرت و عمل کے اعتبار سے کوئی بلند تر نمونہ نہیں چھوڑا، کم از کم اتنا تو کیا ہوتا کہ ابوالکلام کا "الہلال" اس کے جمالِ ادبی کے سامنے گہنا جاتا۔ حالی کا وہ مسدس جو نصف صدی سے گونج رہا ہے خاموش ہو جاتا اور حکیم الامت ڈاکٹر اقبال کی شاعری اس کی چاکری کرتی، یہ کیا بدمذاقی ہے کہ "براہین احمدیہ" شب ہجراں سے بھی زیادہ طویل ہونے کے باوجود ایک پیرا اور جملہ اپنے اندر ایسا نہیں رکھتی کہ جس سے ذوق کی تسکین ہو سکے۔ کیا یہی نبوت ہے؟

ختمِ نبوت اور اس کے حدود و اطلاق

ایک نیا جائزہ

- نئی بات کہنا مشکل ہے
- بیچ کے کچھ زینے
- کہنے کا ڈھنگ
- ڈھنگ سے کیا مقصود ہے
- فکر و استدلال کے تین اصول
- مناظرانہ ذہنیت
- اس کا نتیجہ
- اس کا اثر اعمال پر
- مرزائی نقطۂ نظر کا صحیح تجزیہ
- حیاتِ مسیح
- کیا مناظرہ جنگ ہے
- مناظرہ اور دعوت
- مناظرہ اور تبادلہ خیال
- ہر شے کے دو مزاج ہوتے ہیں
- طبیعات کی ایک مثال
- مکانیکی ثبوت
- حسن کی حقیقت
- استدلال و استنباط کا معاملہ
- ایک نکتہ
- دوسرا مقدمہ
- تیسرا اصول
- فکر و استدلال کی عام لغزش
- ایک مثال
- دوسری مثال
- تنبیہ کی ضرورت
- خلاصہ بحث

"ختم نبوت اور اس کے حدود واطلاق"

(ایک نیا جائزہ)

مرزائیت سے متعلق مسائل پر اب جو قلم اٹھا ہے۔ تو میں چاہتا ہوں کہ اس کے تمام متعلقات ایک نئے زاویہ نظر سے ضبطِ تحریر میں آ ہی جائیں۔ پھر اللہ جانے اس کا موقع ملے یا نہ ملے' کیونکہ غور وفکر کے ہدف ومعیار اس تیزی سے بدل رہے ہیں کہ بہت ممکن ہے۔ آئندہ مذہب پر اظہارِ خیال ہی دقیانوسیت سے تعبیر ہو۔ سب سے بڑا مسئلہ جو اس خصوص میں فیصلہ کن ہو سکتا ہے۔ "ختمِ نبوت" ہے۔ اگر یہ حقیقتِ ثابتہ معرضِ بحث سے نکل کر پھر حقیقت کی حیثیت اختیار کر لے۔ اور اس کے تمام متعلقہ گوشے وضاحت سے سامنے آ جائیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک مفید علمی کوشش ہوگی۔

نئی بات کہنا مشکل ہے

جہاں تک نفسِ دلائل کا تعلق ہے۔ باوصف تحقیق اس باب میں کوئی نئی بات اور بالکل اچھوتی بات ڈھونڈ لانا کہ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ (الرحمٰن،۷۴) (نہیں ہاتھ لگایا کسی انسان نے پہلے اس سے اور نہ جنوں نے) مشکل ہے۔ کیونکہ جب سے جھوٹے مدعیانِ نبوت نے سر اٹھایا ہے۔ علماءِ حق نے برابر ان کی تردید کیلئے ان مباحث کی چھان بین کی ہے۔ اور شاید ہی کوئی گوشہ ایسا چھوڑا ہو۔ جو آنے والوں کے لئے موضوعِ فکر ہو سکے۔ لیکن صرف دلائل ہی سب کچھ نہیں ہوتے۔ بعض اوقات ان کو

قرینے سے پیش کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ایک ہی حقیقت باوجود بار بار زیرِ نظر ہونے کے بسااوقات ذہن سے اوجھل رہتی ہے اور پھر سلیقے کے ایک ہی اشارہ سے سہو و مدہوشی کا سارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔قرآن حکیم کے دلائل پر کبھی لکھنے کا موقع ملا۔تو اس کی اس خوبی پر کھل کر بحث کی جا سکے گی۔ کہ آیات و شواہد کے پیش کرنے میں یہ کن کن اداؤں میں دوسروں سے ممتاز ہے۔ یہاں صرف اتنا یاد رکھئے کہ وہ کوئی انوکھی اور جدید بات لے کر نہیں آیا۔ نئے نئے دلائل کی اخلاقی وتکوین اس کا ہرگز منصب نہیں۔ وہ تو انہی حقیقتوں کو جو ہمارے گردوپیش پھیلی ہوتی ہیں۔ اور جن پر کبھی نگاہِ اعتبار نہیں پڑتی اور اگر پڑتی ہے تو غور وفکر کیلئے نہیں رکتی۔اس ڈھنگ سے پیش کرتا ہے کہ ذہن کی تمام صلاحیتیں خود بخود انہی حقیقتوں پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔اور اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ان کے لئے نہیں رہتا۔ کہ یا تو ایک دم جھٹلائیں۔اور یا پھر ان کی تصدیق کریں۔ یہ انداز اور یہ ڈھب حقیقی شے ہے۔

بیچ کے کچھ زینے

یوں سمجھئے کہ فکر سے پہلے اصابتِ فکر کا مرتبہ ہے۔سوچنا اور بات ہے۔اور صحیح سوچنا اور بات! بسااوقات ایک مسئلہ پر ہم گھنٹوں بحث کرتے ہیں۔علمِ منطق کے تمام حربے استعمال میں لاتے ہیں۔اور پھر بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے۔لیکن جب ایک بارگی خود حقیقت ایک دوسرے انداز میں ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔تو ہمیں اپنی بیچارگی وجہل پر افسوس ہوتا ہے۔ کہ یہی بات تو ہزار دفعہ دورانِ بحث مناظرہ میں دلائل واعتراضات کی شکل میں ہمارے سامنے آئی۔لیکن دل میں نہ اتر سکی۔اب یہ کیا معاملہ ہے کہ یہی چھوٹی سی اور نہایت پیش پا افتادہ حقیقت ہماری آنکھیں کھول دینے کیلئے دل کی طرف بے اختیار بڑھ رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ انسانی ذہن تک

اترنے کیلئے پیچ کے کچھ زینے ہیں ان کونظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔اگر ذہن صاف ہے۔

دلائل میں کوئی الجھاؤ نہیں۔اور پیش کرنے کا ڈھب منطقی طور پر استوار ہے۔تو بات منوانے میں ایک منٹ کی تاخیر نہیں ہوگی۔تاخیر والتواء یا ڈھیل کے تین ہی سبب ہو سکتے ہیں۔یا تو جو بات آپ کہتے ہیں وہ مبنی بر حقیقت نہیں۔یا پھر سننے والے کا ذہن صاف اور اخاذ نہیں۔یا پھر مسئلہ کو پیش کرنے کا ڈھنگ صحیح نہیں۔

کہنے کا ڈھنگ

اس تیسری بات کو میں زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔میرے نزدیک کہنے کا اسلوب زیادہ درخور اعتنا ہونا چاہئے۔بارہا ایسا ہوا ہے۔کہ ذہن کی کجی اور غیر استواری کے باوجود جب کوئی بات ڈھب کی کی گئی۔تو اس نے دل میں کہیں نہ کہیں جگہ پیدا کر ہی لی۔

ڈھنگ سے کیا مقصود ہے

ڈھنگ سے کہنے سے مقصود صرف لفاظی نہیں۔یا فصاحت و بلاغت نہیں کہ اس کا مرتبہ بعد کا ہے۔اصل شے یہ ہے۔کہ جس مسئلہ کو آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔پہلے آپ یہ دیکھ لیں۔کہ خود اس کا مرتبہ کیا ہے۔یعنی یہ محکمی و استواری کے کس درجہ میں ہے۔اس کے بعد اس پر غور فرمائیے کہ اب تک جو اسے پیش کیا گیا ہے تو اس میں کن باریک علمی رعائتوں کو نظر انداز کر دینے سے اس کی مؤثریت میں فرق آیا ہے؟ وہ کیا نفسیاتی یا منطقی نقائص ہیں۔جن کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوتی رہی۔اس کے بعد بھی اگر خصم نہیں مانتا۔تو پھر آپ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔پھر آپ کے پاس یہ

معقول عذر ہے۔ کہ ممکن حد تک آپ کوشش فرما چکے۔ مقدمہ کی خرابیاں آپ کے بس کا روگ نہیں۔ پانی میں سیدھی سے سیدھی شے بھی ٹیڑھی نظر آئے گی فطرت کا بدلنا ہمارے لئے دشوار ہے۔

انہی حقائق کے پیش نظر آیئے۔ ہم مسئلہ ختم نبوت اور اس کے حدود اطلاق پر غور کریں۔ اور دیکھیں۔ کہ سقم کہاں پیدا ہوا؟ کیا صرف وہ نفسیاتی ہے۔ یا استدلال و استنباط میں کہیں خامی ہے؟ سر دست یہ اگر چہ ایک مسلّمہ مسئلہ ہے۔ اور اپنے معنوں میں بالکل واضح۔ تاہم اسے معرضِ بحث میں لانے پر ہم مجبور ہیں۔ اس کا فیصلہ کہ حقیقتِ ثابتہ کیا ہے۔ اب دلائل پر موقوف ہے۔ اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونا بہرآئینہ بہت مشکل ہے کہ ایک حقیقت کو بحث کی سطح پر لایا جائے۔ اور پھر اس حقیقت کی سطح تک پہنچایا جائے۔ مگر اس کا کیا کیجئے۔ کہ ایسا ہونا ضروری ہے۔ کہ یہاں ذہنوں کی ساخت یک قلم مختلف ہے۔ سمجھنے کا انداز جدا جدا ہے۔ جو بات آپ کو اصول کی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔ وہی دوسرے کے نزدیک مشکوک اور یکسر باطل۔

فکر و استدلال کے تین اصول

ہم نے جہاں تک اس مسئلہ کی تفصیلات پر غور کیا ہے۔ یہاں پر تین مقدمات ایسے ہیں جن کی وضاحت ہو جانا چاہیئے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ تین اصول ہیں جن کو بہرآئینہ ہر بحث میں مرعی رہنا چاہیئے۔ ہم نے تمام اخلاقی مسائل پر غور کیا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں۔ کہ فکر و استدلال میں جہاں کہیں فروگزاشت ہوتی ہے۔ وہ انہیں تین حقیقتوں کو نظر انداز کر دینے سے ہوتی ہے۔ یعنی ان تین مقدمات کا درجہ یہ ہے۔ کہ ان پر غور و فکر کر لینے سے ہر ہر مسئلہ میں آپ کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے اور اس کی مدد

سے آپ فوراً معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ استدلال کے اشہب تیز خرام نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ ان میں ایک حقیقت نفسیاتی مزاج کی ہے اور دوسری دو منطقی انداز کی۔

مناظرانہ ذہنیت

پہلے نفسیاتی حقیقت کو لیجئے۔ کسی مسئلہ پر غور کرتے وقت یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ ذہن پر مناظرانہ کیفیتیں اثر انداز نہ ہوں۔ یعنی آپ بحث کے موڈ میں نہ ہوں۔ کہ یہ ایک ایسی بیماری ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن ہے۔ کہ نظر و فکر میں وہ کلیت و جامعیت پیدا ہو سکے۔ جو دن کے اسرار تک انسان کو پہنچاتی ہے۔ مناظر میں سب سے بڑا نقص جو پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ باوجود ذہانت اور جودت طبع کے کبھی اس لائق نہیں ہو پاتا۔ کہ دین کے مزاجِ کلی پر غور کر سکے۔ دین کے مصالح پر نظر ڈال سکے کہ اس کے اصول و بنیادی تقاضے کیا ہیں؟ اس کے الٰہیات' اخلاق' عبادات اور معاشرتی و اقتصادی نقشے انسان کو کس منزل کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کے ماننے سے کس نوع کا طبقہ ظہور پذیر ہوتا ہے؟ کس طرح کے اخلاق سے انسان آراستہ ہوتا ہے۔ اور عادات و عوائد میں کیا تغیر رونما ہوتا ہے؟ وہ کیا سلجھاؤ اور شائستگی ہے جو اس کا مایۂ افتخار و نازش ہے؟ یعنی مذہب کا وہ جمال اور حسن جو اس کی بنیاد اور اساس ہے۔ مناظر کی نظر سے اوجھل رہتا ہے۔ اس کی نظر میں ایک طرح کی ٹیڑھ اور کجی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے سبب سے جزئیات کی ٹٹول اور جستجو میں لگا رہتا ہے۔ اور اصول اس کی نظر سے مخفی رہتے ہیں۔ اس کی ساری پر چول شاخوں اور پتیوں تک ہی رہتی ہے۔ اور اس تحقیق و تفحص کی مناظرانہ موشگافیوں میں اسے موقع ہی نہیں ملتا۔ کہ اس کے اس جمال سے لطف اندوز ہو سکے۔ جس کا تعلق پورے

درخت کے پھیلاؤ سے ہے۔ گویا یہ پیڑ گننے کا قائل ہے۔ آم کھانا اس کے مقاصد میں داخل نہیں۔

اس کا نتیجہ

اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ نظر کی جزئیت کی وجہ سے اسلام پر جب غور کرے گا۔ تو جزئی حیثیت سے' اگر وہ معتزلی ہے۔ تو یہ دیکھے گا کہ کن کن آیات سے اعتزال کی تائید ہوتی ہے۔ ارجاء کا قائل ہے۔ تو سارا زور اس پر لگائے گا کہ ارجاء کی آیات تلاش کی جائیں۔ اس طرح جبری یا قدری ہے تو اپنے ڈھب کی آیتیں دکھلائے گا۔ اس کو اس سے کچھ مطلب نہیں ہو گا کہ اسلام بحیثیت مجموعی ہم سے کیا چاہتا ہے؟ جن لوگوں نے قرآن حکیم کی تفاسیر کو دیکھا ہے۔ اور بالاستیعاب پڑھا ہے۔ انہوں نے دوران مطالعہ میں یہ کوفت محسوس کی ہو گی۔ کہ اس طرح کی بحثوں نے کیونکر قرآن کی حقیقی معنویت اور خوبیوں کو چھپا رکھا ہے۔ بہت بڑا نقصان اسلام کو یہ پہنچا ہے کہ اس کے حکم و اسرار چند لاطائل بحثوں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اتنی جلیل القدر کتاب صرف مناظرانہ گتھیوں کو سلجھانے کیلئے نازل ہوئی ہے۔ انسانی زندگی کو سنوارنا اس کا مقصد نہیں۔

اس کا اثر اعمال پر کیا ہوتا ہے؟

عملی اعتبار سے اس کا اثر طبائع پر یہ ہوتا ہے۔ کہ مذہب کے تقاضے صرف اس قدر رہ جاتے ہیں کہ مخصوص مسائل پر آپ کے ذہن میں کتنا مواد جمع ہے؟ اور کن کن دلائل سے آپ اپنے مسلک کو حق بجانب ٹھہرا سکتے ہیں؟ مذہب کی روح سے استفادہ پوری عملی زندگی میں اس سے رہنمائی کا ولولہ اور شوق یا اخلاق و عادات میں ایک

خاص طرح کا امتیاز قائم رکھنے کی تڑپ دائرہ عمل سے خارج قرار پاتی ہے۔ یعنی ایک مناظر اگر وہ مرزائی ہے تو اس کی تمام تر مذہبی زندگی کا مدار اس پر ہوگا۔ کہ وہ حیاتِ مسیح علیہ السلام کے مسئلہ پر بڑے سے بڑے عالم سے ٹکرا سکے۔ ختمِ نبوت کے مضبوط حصار کو توڑ سکے۔ مرزا صاحب کی کبھی نہ پوری ہونے والی پیش گوئیوں کو ایسی ترازو پر تول سکے۔ جس سے یہ معلوم ہو کہ یا تو تمام پہلے انبیاء علیہم السلام معاذ اللہ اسی طرح کی مہمل اور متضاد باتیں کرتے رہے ہیں اور یا پھر پیشین گوئی چیز ہی ایسی ہے کہ اس کے ٹھیک ٹھیک منشا تک رسائی ناممکن ہے۔ پھر اگر یہ منشا اس کے زعم کے مطابق پورا ہو جاتا ہے۔ تو اس کی نفسیاتِ مذہبی کی تسکین ہو جاتی ہے۔ وہ اب اس کا ہرگز مکلّف نہیں ہے۔ کہ مذہب کے اصولی و اساسی تقاضوں پر عمل پیرا بھی ہو۔ یہ بات صرف مرزائی مناظر ہی سے مخصوص نہیں۔ دینی تصور کا یہ بگاڑ ہر اس شخص میں پیدا ہو جاتا ہے جو اس ذہن کا حامل ہے۔ یعنی بحث و جدل کی اہمیت اس گروہ میں اس درجہ محسوس کی جاتی ہے کہ اسی کو حاصلِ دین سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر آپ نزاعی مسائل پر ان کے انداز اور اسلوب پر نہیں سوچتے تو یہ کبھی آپ کی اصابت رائے کے قائل نہیں ہوسکیں گے۔

مرزائی نقطہء نظر کا صحیح تجزیہ

یوں تو یہ ذہنیت بجائے خود اس لائق نہیں ہے۔ کہ کسی مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی توقع اس سے کی جاسکے۔ لیکن جو کجی خصوصیت سے اس اندازِ فکر سے ذہن میں پیدا ہوتی ہے وہ تنگ نظری ہے۔ ایک مناظر کسی مسئلہ پر غور کرتے وقت اس کی تمام متعلقہ تفصیلات پر سوچ بچار کی کبھی زحمت گوارا نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کا انداز یہ

ہوگا۔ کہ یہ ایک آیت یا ایک حدیث جس کو دیکھے گا۔ کہ اس کے مقصد کو کسی حد تک پورا کر سکتی ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لے گا اور کوشش کرے گا۔ کہ یہیں کھونٹا گاڑ کر بیٹھ جائے۔ اب نہ تو وہ خود یہاں سے ہلے گا اور نہ آپ کو ہلنے دے گا۔ اس کی یہ خواہش ہوگی کہ اسی ایک آیت یا حدیث سے وہ تمام تفصیلات جو مطلوب ہیں نکل آئیں۔ حالانکہ قرآن یا سنت کا یہ انداز نہیں۔ بلکہ ہر ہر مسئلہ کیلئے وضاحت و تفصیل کا یہاں ایک مقام ہوتا ہے۔ اور قرآن و حدیث میں کسی مسئلہ کے تفحص کیلئے یہ ضروری ہے کہ اسی مقام پر نظر ڈالی جائے۔ اور یہ دیکھا جائے کہ اس خصوص میں ہمیں کتاب و سنت کے سرچشموں سے کیا ملتا ہے۔ جن لوگوں نے مرزائیوں سے بحث کی ہے وہ ہماری تائید کریں گے۔ کہ یہ ان کے انداز بحث کا صحیح تجزیہ ہے۔ یہ لوگ جب حیاتِ مسیح علیہ السلام کے مسئلہ پر غور کریں گے تو اس انداز سے نہیں کہ اس بحث کی منطقی تنقیحات کیا ہو سکتی ہیں؟ اور اس گتھی کو سلجھانے کیلئے ہمیں کن راستوں پر گامزن ہونا چاہئے اور کتاب و سنت کے کن کن مقامات سے استفادہ کرنا چاہئے؟ بلکہ اس کے برعکس یہ صرف اس پر اکتفا کریں گے۔ کہ اپنے ڈھب کی کچھ آیتیں ڈھونڈ لیں۔ سیاق و سباق سے انہیں علیحدہ کریں اور تاویل و ترجمہ کی تحریفات سے ایسے ایسے معنی پہنائیں۔ کہ ان کی مطلب براری ہو سکے۔ سنت کے ان مقامات کو یہ چھوڑ دیں گے۔ جہاں اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے یا اصولاً پڑ سکتی ہے۔ اور نظر وہاں دوڑائیں گے۔ جہاں سرے سے یہ مسئلہ بیان کرنا مقصود ہی نہیں۔

حیاتِ مسیح علیہ السلام کی متعلقہ تنقیحات

ان کے اس اندازِ استدلال کی مثالیں بہت ہیں۔ اور ان کی تفصیل اتنی دلچسپ

ہے کہ اگر نفسِ موضوع سے ہٹ جانے کا خطرہ لاحق نہ ہوتا۔ تو میں قطعی بیان کرتا۔ وضاحت کیلئے صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ لگے ہاتھوں آپ حیاتِ مسیح علیہ السلام سے متعلق یہ معلوم کر لیجئے۔ کہ وہ کیا تنقیحات ہیں جن پر روشنی ڈالنی چاہئے۔ اور وہ کیا انداز ہے سوچنے کا جو درست نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔ اور مرزائی کیونکر اس انداز سے پہلو تہی کرتے ہیں؟ سب سے پہلے اس کی تاریخی پچھواڑ پر غور فرمایئے۔ کہ یہودی بھی ایک مسیح کے منتظر ہیں۔ اور عیسائی بھی اس کی آمد ثانی کے قائل اور اس کی زندگی کے معترف۔ اب قرآن کا منصب یہ ہونا چاہئے۔ کہ وہ دونوں کے اس متفقہ عقیدے کے مقابلہ میں بتائے کہ اس کی کیا روش ہے؟ آیا مسیح علیہ السلام کا انتقال ہو چکا۔ یا وہ ابھی زندہ ہیں اور دوبارہ آئیں گے؟

فرض کر لیجئے۔ کہ قرآن کے نقطہءِ نظر سے ان کا انتقال ہو چکا۔ جیسا کہ مرزائی سمجھتے ہیں۔ اگر یہ پوزیشن صحیح ہے۔ تو قرآن کو بڑے صاف لفظوں میں دوٹوک اس رائے کا اظہار کر دینا چاہئے۔ اس لئے بھی کہ اس سے ایک تاریخی نزاع کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے فیصلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن صورتحال یہ ہے کہ یہ مسئلہ جس ڈھنگ سے قرآن میں مذکور ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہر آئینہ استدلال کا مسئلہ ہے۔ اب وہ صحیح ہو یا غلط اس سے بحث نہ کیجئے۔ اس پر غور فرمایئے گا۔ نصِ صریح کا کسی صورت میں بھی نہیں یعنی ثبوت کا مزاج استدلالی ہے۔ جو بحث و نزاع کا ہدف ہو سکتا ہے۔ ایسا واضح نکھرا ہوا اور متعین نہیں۔ کہ اس میں اختلاف کیلئے کوئی گنجائش نہ ہو۔ یہ بر سبیل تنزل ہے۔ ورنہ ہماری رائے میں ان کی زندگی سے متعلق اشارات اس سے کہیں زیادہ واضح ہیں۔ اس نکتہ کے فہم پر اگر مناظرانہ تنگ نظری قادر نہ ہو تو اس تنقیح

پر غور فرما لیا جائے۔ کہ عیسائیوں کے نقطۂ نظر سے حضرت مسیح علیہ السلام خدا اور خدا کے بیٹے ہیں۔ اب اگر حضرت مسیح علیہ السلام کا انتقال ہو چکا ہے۔ تو یہ اس عقیدہ پر ایسی براہِ راست چوٹ ہے۔ جس کی سہار عیسائیت میں بالکل نہیں۔ لیکن کتنے تعجب کی بات ہے کہ سارے قرآن میں ایک جگہ بھی وفاتِ مسیحؑ کو بطور ابطالِ الوہیت مسیح کے پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ قرآنِ حکیم جب یہ بتانا چاہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام الٰہ نہیں ہیں تو وہ دور کے لوازم کا تذکرہ کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے:-

اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰهِ کَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنَ (آل عمران ۵۹)

مسیح کی مثال عند اللہ ایسی ہے جیسے آدم علیہ السلام کی کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اسے کن فیکون کہا"۔ کبھی فرماتا ہے:-

اَنّٰی یَکُوۡنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَکُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (الانعام:۱۰۱)

اللہ کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اس کی جورو ہی نہیں"۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے۔

کَانَا یَاۡکُلٰنِ الطَّعَامَ (المائدہ:۷۵)

مسیح اور اس کی ماں تو کھانے کی احتیاج بھی محسوس کرتی تھیں"۔

اور یوں نہیں فرما دیا کہ عیسائیو! تم کس پھیر میں ہو جو مر چکا وہ خدا کیونکر ہوسکتا ہے۔ حالانکہ قرآن کے اسلوبِ بیان کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ جب وہ اعتراض کرتا ہے تو ایسی پوزیشن اختیار کرتا ہے۔ جو زیادہ مضبوط ہو۔ اور اس باب میں اس کو آخری پوزیشن یا فیصلہ کن پوزیشن قرار دیا جا سکے۔ مسیح علیہ السلام کا آدم علیہ السلام کی طرح ہونا یا اللہ

کی جورونہ ہونا یا مسیح علیہ السلام یا اُن کی ماں کا کھانا کھانا اعتراضات تو ہیں۔ لیکن فیصلہ کی جو طاقت اس وار میں ہے کہ مسیح علیہ السلام کا انتقال ہو چکا ہے وہ ان میں بالکل نہیں۔ لہٰذا اگر قرآن نے وضاحت کی یہ پوزیشن اختیار نہیں کی تو لامحالہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قرآن کے نقطہ نظر سے مسیح علیہ السلام کی موت متیقن نہیں ورنہ وہ کبھی اس اعتراض سے نہ چوکتا۔

کیا مناظرہ جنگ ہے؟

وفاتِ مسیح علیہ السلام کا مسئلہ اس وقت موضوعِ بحث نہیں۔ یہ تو ایک مثال ہے۔ سمجھانا یہ مقصود ہے۔ کہ مناظرانہ کج بحثی کیونکر اصابتِ فکر سے روکتی ہے اور کس طرح واضح اور فیصلہ کن متعلقات کو نظروں سے اوجھل رکھتی ہے۔ نوک جھونک اور دلائل و براہین کی نمائش اور بات ہے۔ اور حقیقت تک رسائی بالکل دوسری شے۔ جن لوگوں نے مناظروں کو دیکھا ہے۔ اور سنا ہے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ فریقین کس طرح بحث میں ایک دوسرے کو الجھاتے ہیں۔ حیرت و پریشانی کے کیا کیا سامان پیدا کئے جاتے ہیں۔ اور کس کس انداز میں مخالف کی سادگی سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کس کس طرح غلط بیانی کی جاتی ہے؟ اور اسے الحرب خدعہ کہہ کر جائز ٹھہرایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ سرے سے حرب ہی نہیں۔ یہاں تو غرض افہام و تفہیم ہے۔ یعنی اپنی بات سمجھانا اور دوسرے کی سمجھنا مقصود ہے۔ لیکن وہ اس اعتبار سے اسے حرب کہنے میں حق بجانب ہیں کہ فریقین کی نفسیات مناظرہ میں واقعی اس طرح کی ہو جاتی ہیں۔ گویا باہم خصم اور مخالف ہیں۔ منشا ایک دوسرے کو پچھاڑنا ہے اور شکست دینا ہے سمجھانا نہیں۔

مناظرہ اور دعوت کے تقاضے جدا جدا ہیں

جب مناظرہ کی غرض وغایت یہ قرار پائے۔ کہ مخالف پر کیونکر فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔ تو اس کا مزاج دعوتِ دینی کے مزاج سے بالکل مختلف ٹھہرے گا کیونکہ دین تو یہ چاہتا ہے۔ کہ خطاب میں ایسی مؤثریت' ایسی شیرینی' ایسی مٹھاس اور جاذبیت ہو کہ سننے والا اثر قبول کرکے رہے۔ اور مناظرہ کے تیور اس بات کے متقاضی ہوں گے کہ اس میں جنگ کا دم خم ہو۔ جنگ کا سا ادعا اور للکار ہو اور جنگ ہی کی طرح کا اندازِ گفتگو ہو۔ مذہب و مناظرہ بظاہر اگرچہ حلیف و دوست معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً ان کے راستے جدا جدا ہیں۔ مذہب کے معاملہ میں بسا اوقات ہار جانا فتح کے مترادف ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنی غلطی نہ صرف یہ کہ تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ بلکہ غلطی پر متنبہ کرنے والے کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور مناظر ہمیشہ معصوم ہوتا ہے اس سے یا تو کبھی لغزش سرزد ہی نہیں ہوتی۔ اور یا پھر اس لغزش کا اخفاء ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ تخالف تو داعی کی نسبت سے ہوا۔ وہ شخص جس کو آپ کسی دینی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر مناظرہ کا ڈسا ہوا نہیں ہے تو نہایت توجہ سے آپ کی باتوں کو سنے گا۔ اور پوری شکرگذاری کے ساتھ ان کی پذیرائی کرے گا۔ لیکن اگر وہ ایسی طبیعت نہیں رکھتا۔ اور اس کے دل و دماغ پر بحث کا لگا لگ چکا ہے۔ تو سمجھ لیجئے کہ دل کی صحت رخصت ہو چکی۔ وہ آسانی سے ماننے والا نہیں بات بات پر یہ کوسے گا اور ایسی مین میخ نکالے گا۔ کہ آپ پریشان ہو جائیں گے۔

مناظرہ اور تبادلہء خیال میں فرق

اس غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ کہ تبادلہء خیالات کو ہم مناظرہ سے تعبیر نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ ایک ناگزیر تقاضا ہے۔ جب تک دنیا میں فہم وفکر کے پیمانے مختلف رہیں گے۔ تبادلہء خیالات کی ضرورتوں کو برابر محسوس کیا جائے گا۔ کیونکہ رفعِ نزاع اور رفعِ اختلاف کی اور کوئی صورت بجز اس کے ہمارے ذہن میں نہیں آتی۔ کہ دو معقول آدمی بیٹھ کر گفتگو سے معاملہ کو سلجھالیں۔ یا باہمی افہام وتفہیم سے ایک دوسرے کو قائل معقول کرلیں۔

ہم جس چیز کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور جس بیماری کو اصابت فکر کے لئے مہلک سمجھتے ہیں وہ مناظرانہ ذہنیت ہے۔ مجادلہ بالاحسن تو وظیفہء انبیاء (علیہم السلام) ہے یعنی ایسے طریق اور ڈھب سے اپنے مقصود کو پیش کرنا جو مخالف کے نقطہء نظر سے بھی معیوب نہ ہو خالص پیغمبرانہ صفت ہے۔ ایک باریک اور حکیمانہ فرق مناظر اور داعی میں یہ ہے کہ مناظر کی زد میں صرف دلائل واعتراضات کا ایک انبوہ ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ مخالف پر قابو پانے کیلئے ایک طرح کی اخلاقیت کی بھی ضرورت ہے لیکن داعی دلائل کو اتنا اہم نہیں سمجھتا۔ جتنا کہ اخلاقیت کو درخور اعتنا قرار دیتا ہے۔

یوں سمجھئے کہ مناظر کے سامنے صرف فنِ مناظرہ اور اس کے تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ رشید یہ کہ ہر ہر حرف کی پابندی کا التزام کرتا ہے۔ لیکن اس کتاب کو پڑھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ جو اس کی لوحِ دل پر مرتسم ہے۔ اس کے برعکس ایک داعی یہ دیکھتا ہے۔ کہ مخاطب میں رشد وہدایت کے دواعی کیونکر بیدار ہوسکتے ہیں۔ پھر اگر وہ محسوس کرتا ہے۔ کہ یہاں دلائل کے پیچھے بھاگنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ تو وہ نفسِ

مخاطب کا تعاقب کرتا ہے اور نقض و معارضہ کی راہوں کو چھوڑ کر استدلال کی ایسی راہیں اختیار کرتا ہے۔ جو سیدھی اس کے دل تک پہنچتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھئے کہ نمرود سے بحث کرتے وقت جب یہ دیکھتے کہ اس دلیل سے '' رَبِّیَ الَّذِی یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ (البقرہ:۲۵۸) ''میرا پروردگار وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے'' اس کی تسکین نہیں ہوتی........ تو اس دلیل پر اس کو جو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کا ازالہ نہیں فرماتے۔ بلکہ آسانیٔ فہم کیلئے ایک اور مشاہدہ عبرت اس کے سامنے پیش فرما دیتے ہیں۔ کہ اچھا یہ نہیں نہ سہی۔ اس دلیل پر غور کرلو! '' فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ (البقرہ:۲۵۸)

''اللہ تو اپنی قدرتِ کاملہ سے آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے۔ تم بھی اگر اس کارخانہ پر قابو رکھتے ہو تو یہ سمت بدل دو''۔

ظاہر ہے۔ دوسری دلیل پہلی دلیل سے کچھ قوی نہیں ہے۔ اور نہ پہلی دلیل ایسی غیر واضح ہے۔ کہ اس پر نمرود کے اعتراض کو صحیح سمجھا جائے۔ تاہم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مناظرہ کی منطق سے پہلوتہی کی اور تفہیم کا دوسرا انداز اختیار کیا۔ ہم جو مسائل کے فہم میں یہ سمجھتے ہیں۔ کہ پہلے مناظرانہ اثرات سے دماغ کو پاک کرلیا جائے۔ تو یہ بالکل وہی حقیقت ہے جسے قرآن ''شہادتِ قلب'' سے تعبیر کرتا ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰالِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْاَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ(قٓ:۳۷)

''اس میں یقیناً نصیحت کی بات ہے۔ لیکن اس شخص کے لئے جس کے پہلو میں دل ہے یا جو توجہ سے سنتا ہے اور اس کا دل اس پر شاہد ہے''۔

کیونکہ اگر پہلے ایک رائے قائم کر لی گئی ہے۔تو پھر یہ ناممکن ہے کہ جانچ پرکھ کے اصولوں کا اعتدال کے ساتھ استعمال ہو سکے۔نزاعی مسائل میں بالخصوص جب کسی فیصلہ پر پہنچنا مقصود ہو۔ذہن کو اس تجریدی سطح پر لے آنا چاہئے کہ گویا پہلی دفعہ آپ ایک موضوع پر غور کر رہے ہیں۔اور کوئی سابقہ تعجب یا پہلا عقیدہ آپ کے آزادانہ غور و فکر میں حائل نہیں۔

ہر شے کے دو مزاج ہوتے ہیں

طبیب ممکن ہے اس حقیقت کو نہ مانیں۔مگر یہ ایک سچائی ہے کہ ہر دوا کا مزاج دوہرا ہوتا ہے۔ایک مزاج وہ ہوتا ہے جو ہر ہر دوا میں قدرت نے پنہاں رکھا ہے۔اور ایک مزاج وہ ہے جو دواؤں کے ساتھ ملانے سے ابھرتا ہے۔یعنی بنفشہ کی ایک خصوصیات وہ ہیں۔جن کی وجہ سے وہ بنفشہ ہے۔اور کچھ نئے اثرات اور نئی کیفیات ہیں۔جو دوسری دواؤں کے ساتھ ملنے سے اس میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔مفرد و مرکب کے مزاج و خصوصیات کا اختلاف اتنا واقعی اور حقیقی ہے کہ اس میں قطعاً اختلاف کی گنجائش نہیں۔بسا اوقات مختلف ادویہ کو باہم ملانے اور آمیخت کرنے سے اس طرح کا ایک نیا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔اور نئی نئی خصوصیات ظہور پذیر ہوتی ہیں کہ خود طبیب حیران رہ جاتا ہے۔

طبیعات کی ایک مثال

اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کیلئے طبیعات کے اس عام مسئلہ پر غور کیجئے۔کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن دو گیسیں ہیں۔جن کو اگر علیحدہ علیحدہ دیکھا جائے تو

کہیں نمی کا نشان نہیں ملتا۔ یعنی اگر تجربہ یہ نہ بتادے۔ کہ دونوں کے باہم ملنے سے پانی معرضِ ظہور میں آتا ہے۔ تو صرف ان دونوں کا الگ الگ مطالعہ اس نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ دونوں کا مزاج اپنی طبعی خصوصیات کی وجہ سے پانی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ یہ دونوں بہر آئینہ گیسیں ہیں۔ جن میں مائیت کی بجائے آتش پذیری کی صلاحیتیں زیادہ نمایاں ہیں۔

مکانکی ثبوت

اسی اصول کو مکانکی انداز سے دیکھیے کہ ایک مشین' ایک انجن اور کل پرزوں کا بہت بڑا مجموعہ اس کا ایک وظیفہ ہے۔ اور وہ جن پرزوں پر مشتمل ہے۔ ان کا اپنا علیحدہ علیحدہ ایک کام ہے۔ اگر ایک شخص ریڈیو کے بکھرے ہوئے اجزاء کو دیکھے تو وہ کسی ایک پرزے کو دیکھ کر یہ پیشین گوئی نہیں کرسکتا کہ یہی جب دوسرے اجزاء سے مشین میں جڑے گا تو اس میں سے نغمہ و موسیقی کے چشمے ابلنے لگیں گے۔ بھاپ بظاہر کتنی ہلکی شے ہے لیکن یہی ترتیب پا کر اور دوسرے کل پرزوں سے مل کر بڑے بڑے انجنوں کو بجلی کی سی رفتار سے حرکت دیتی اور چلاتی ہے۔

حسن کی حقیقت

جمالیات میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ یہاں بھی حسن کا مفہوم یہ نہیں کہ لذت نظر کا پورا پھیلاؤ جسم کے ایک ہی حصہ میں سمٹ آیا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ ایک بالکل نئی حقیقت ہے جو مختلف حقیقتوں کے امتزاج و ترتیب سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی صرف کاکل و گیسو کا پیچ و خم ہی اسے معرضِ ظہور میں نہیں لاتا۔ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی

شرط ہے۔ کہ اس کا تعلق ایک حسین چہرہ سے بھی ہو پھر وہ حسین چہرہ بھی تنہا کوئی شے نہیں جب تک ایک براق اور صراحی دار گردن نے اسے نہ تھام رکھا ہو۔ اور بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ پھر اس گردن کو بھی اس طرح کا ہونا چاہیئے۔ کہ جب نظر اس سے پھسلے تو ایسی جگہ جا کر رکے کہ اس رکاوٹ کے بعد دنیا کی اور کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ پھر نظر اور خیال کی بھی کوئی آخری رکاوٹ نہیں اور کئی چیزیں جو نظر کے دامن کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، مسکراہٹیں ہیں، انگڑائیاں ہیں، چال ہے، ادائیں ہیں اور خدا جانے کیا کچھ ہے؟ غرض یہ ہے کہ ان میں ایک ایک چیز کا علیحدہ علیحدہ اگر آپ تصور کریں گے تو ان میں کوئی کشش اور جاذبیت نظر نہیں آئے گی لیکن جب ان سب کی مجموعی فوج تیار ہوگی، تب فتوحات کی وسعتوں کے کیا کہنے۔

یہ حسن جو نغمہ و شعر میں مضمر ہے کہاں سے آیا ہے؟ محض حسنِ امتزاج ہی تو ہے۔ کہ ایک عمدہ سے عمدہ شعر جو آپ کو تڑپا دیتا ہے۔ اور وجد طاری کر دیتا ہے وہ جن الفاظ اور تراکیب پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کو الگ الگ ہزاروں مرتبہ ہم پڑھتے اور دیکھتے ہیں۔ لیکن ہمارا ذہن کبھی متاثر نہیں ہوتا۔ پھر جب ایک صاحبِ فن ان الفاظ کو لے کر سلیقے سے ترتیب دیتا ہے۔ تو اس میں بالکل نئی معنویت پیدا ہو جاتی ہے جو پہلے نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ حقیقت ہے کہ اگر ہماری سائنس اتنی ترقی کرے کہ وہ نغمہ کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کر سکے۔ تو وہ آپ کو یہ بتا سکے گا کہ وہ راگ جو آپ کیلئے لذتِ گوش کا سامان بہم پہنچاتا ہے درحقیقت ایسی آوازوں کا مجموعہ ہے۔ کہ جن کو اگر آپ الگ الگ سن پائیں تو بے توجہی یا نفرت سے منہ پھیر لیں۔

استدلال واستنباط کا معاملہ

غرض یہ ہے کہ ہر شے کے دو مزاج ہوتے ہیں۔ ایک جب وہ تنہا ہو۔ اور ایک جب وہ دوسری چیزوں کے ساتھ ملے۔ ٹھیک اسی طرح فکر واستدلال کا معاملہ ہے۔ یہاں بھی ایک حقیقت یا مفہوم وہ ہے۔ جو ایک آیت یا ایک حدیث میں منفرداً مذکور ہے اور ایک اس کی وہ جامع اور واضح شکل ہے جو کتاب وسنت کے دفاتر وابواب میں مختلف پہلو اور پیرایہ ہائے بیان میں مستور ہے۔ ان دونوں میں وضاحت وتعیین کا جو فرق ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ یہ قطعی ممکن نہیں کہ ایک مسئلہ اپنے طبعی پھیلاؤ کے ساتھ کسی ایک جگہ اس انداز سے آجائے۔ کہ کوئی پہلو اجمال کا اس میں نہ رہے یا کوئی غلط تاویل نہ پیدا ہو سکے یا کسی شک وظن کی گنجائش نہ نکل سکے۔ بلکہ اس کے برعکس قرآن وحدیث کا مسائل کے باب میں یہ انداز خاص ہے جو بالکل فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ کہ ایک مقام پر صرف انہی حقیقتوں کا اظہار ہو۔ جن کا اظہار وہاں مقصود ہے۔ قرآن وسنت کا اندازِ بیان فقہ وقانون یا انسانی فنون سے مختلف ہے۔ کیونکہ ان کے سامنے صرف چند اصول ہی نہیں جن کو سمجھانا مقصود ہے۔ پوری انسانی زندگی ہے پورا معاشرہ ہے زمانہ کا ایک مخصوص ذہن ہے۔ وقت کے رسم ورواج اور تصورات و عقائد ہیں۔ آنحضرت ﷺ مکلّف ہیں کہ ایک خاص تدریج اور ترتیب سے ان تک اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچائیں اور خاص ڈھب سے ان کی ترتیب فرمائیں۔ اس لئے وہاں ترتیب مسائل کا وہ ڈھب قدرتاً نہیں ہو سکتا جو ہم کو فنون کی کتابوں میں ملتا ہے۔ کیونکہ ان کے سامنے صرف فن اور اس کے متعلقات ہیں اور آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک قوم ہے جس کی اصلاح کی ایک خاص رفتار ہے۔ اس لئے قرآن وسنت

کی ہدایت ونصوص اس تاریخی رفتار کے دوش بدوش چلتے ہیں۔

ایک نکتہ

یہی وہ نکتہ ہے جس پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں نے قرآن حکیم میں ازراہ تکلف ربطِ آیات کی تلاش شروع کر دی۔ اور قرآن کو بھی ایک انسانی کتاب بنانا چاہا۔ جس میں ترتیب وبیان کا وہی انسانی ڈھنگ ہے۔ گویا وہ بھی ایک فن ہے۔ اور اس میں بھی وہی ترتیب وربط ہے۔ جو فن کی دوسری کتابوں میں ہوتا ہے۔ حالانکہ کتاب وسنت ایک قوم کی ترتیب کا عملی وعلمی ریکارڈ ہے۔ اس میں جو ترتیب ہے وہ تاریخی ہے۔ واقعات کی ہے۔ مسائل ومضامین کی ہے۔ اس انداز کی نہیں کہ آپ ایک ایک آیت کو ماقبل سے متصل اور جڑا ہوا پائیں۔

دوسرا مقدمہ

اس لئے قدرتاً دوسرا مقدمہ یا اصولِ فہمِ مسائل، جس کا مرعی رکھنا ضروری ہے یہ ہوگا۔ کہ جب کسی مسئلہ پر غور کریں۔ بشرطیکہ وہ مسئلہ اہم اور بنیادی بھی ہو۔ تو اس کے پورے متعلقات کو بیک وقت زیرِ نظر لائیں۔ کتاب وسنت میں تفحص اور تلاش سے ایسے مقامات کا پتہ لگائیں۔ جہاں اس مسئلہ کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ سب تعلقات مل کر ایسی مکمل اور جامع اور ایسی واضح اور روشن تصویر آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ کہ اتنی وضاحت وجامعیت سے وہ کسی ایک جگہ نہیں مل سکے گی۔ یعنی دلائل ومویدات کے پورے پھیلاؤ کو پہلے اپنے سامنے لائیے۔ پھر یہ دیکھئے کہ اب آپ کے تاثرات کیا ہیں؟ یقیناً اس طرح کا یہ تاثر اس تاثر سے بالکل مختلف ہوگا۔ جو

اس ترتیب کو ملحوظ نہ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یوں ایک شبہ جو ایک جگہ ابھرتا ہے۔ دوسری جگہ زائل ہو جائے گا۔ یعنی اگر ایک مخصوص وضاحت ایک آیت میں آپ کو نہیں ملے گی۔ تو وہ دوسرے انداز سے دوسری جگہ مل جائے گی یہی حال احادیث کا ہے۔ کہ ان کو ساتھ ساتھ رکھنے سے شک وشبہ کی تمام گنجائشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں مسئلہ کی لغوی اور ادبی تصریحات کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہے گی۔ اور یفسر بعضه بعضا کا منظر آپ کے سامنے آئے گا۔ کہ جس سے کامل انشراحِ صدر کے مواقع ملیں گے۔ اس سلسلہ میں مناظروں کا عامۃ الورود دھوکہ یا گھپلا یہ ہوتا ہے کہ اس تاثر کو وہ زائل کریں جو تصویر کے پورے رخوں کو دیکھنے سے پیدا ہوا ہے۔ یعنی ایک ڈاکو کی طرح جو بھیڑ اور ہجوم سے بچتا ہے۔ اور اکے دکے مسافر پر حملہ کرتا ہے۔ یہ صرف ایک ایک آیت کو بحث کے لئے چنتے ہیں۔ اور ایک ایک حدیث کو مجموعی تاثر سے الگ کر کے حملہ آور ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن میں چونکہ مسئلہ کے تمام پہلو نہیں رہتے۔ اس لئے کمزور عقل اور تھوڑے علم کا آدمی آسانی سے ان کی تاویلات کا شکار ہو جاتا ہے۔

تیسرا اصول

فکر واستدلال کی گاڑی کو کامیابی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے اس مقدمہ کی رعایت بھی ضروری ہے۔ کہ دعوی اور دلائل میں خصوص وتعین کی مناسبت کا خیال رہے۔ یعنی جس درجہ دعوی میں تعین اور تحدید ہے۔ اسی طرح دلیل کو بھی متعین وخاص (Specific) ہونا چاہئے ورنہ یہ اندیشہ لاحق رہے گا۔ کہ مدعی و مجیب دونوں اپنی اپنی ہانکتے رہیں۔ اور تنقیح طلب نکات بدستور تشنہ ہی رہیں۔

فکرو استدلال کی عام لغزش

روداد مناظرات میں یہ مغالطہ عام ہے ہر مناظر دعویٰ تو کرتا ہے۔ ایک لگے بندھے اور نپے تلے عقیدے کا۔ اور دلائل ایسے پیش کرتا ہے۔ کہ جن کے مزاج میں عموم تو ہوتا ہے۔ مگر وہ کلیت نہیں ہوتی۔ ہر ہر فرد پر جس کا اطلاق بلا محابا ہو سکے اور نہ وہ تعیین و خصوص ہی ہوتا ہے۔ کہ جس سے دعویٰ ثابت ہو سکے۔ موضوع زیرِ بحث میں جہاں جہاں اس انداز کے دھوکے اور گھپلے آئے ہیں۔ میں ان کی چہرہ کشائی نہیں کروں گا۔ کیونکہ ان کی وضاحت تو اپنے مناسب مقام پر ہوگی۔ سرِ دست دوسری طرح کی مثالوں سے اس کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

ایک مثال

متحدہ ہندوستان میں دو سیاسی تنظیمیں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کیلئے بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک کانگرس تھی۔ جس میں مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ پیش پیش تھے اور دوسری جانب مسلم لیگ تھی جس کی عنانِ قیادت مرحوم قائداعظم محمد علی جناح کے ہاتھ میں تھی۔ مولاناؒ کے حامی یہ کہتے تھے کہ انگریزی دان حضرات کو اسلامی مزاج سے کیا مناسبت؟ اور لیگ سے وابستہ اس الزام کا یوں جواب دیتے تھے کہ یہ مانا ابوالکلام آزادؒ بڑا دقیقہ رس عالم ہے مگر یہ سیاسیات کا خارزار ہے۔ یہ قال اللہ وقال الرسول ﷺ کہنے والے کیا جانیں کہ یہاں کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے؟ استدلال کی غلطی دونوں جانب یہ تھی کہ یہ بحث کرنے والے یہ بھول جاتے تھے کہ متنازع فیہ کوئی عالم دین نہیں بلکہ ابوالکلامؒ

ہے جس کی جامعیت اور سیاسیات میں بصیرت ورسوخ کا لوہا بڑوں بڑوں نے مانا ہے۔ اسی طرح سوال صرف کسی مسٹر کا نہیں محمد علی جناح کا ہے جو ہوسکتا ہے دین کی جزئیات کو اتنا نہ جانتا ہو جتنا ایک عالمِ دین جانتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے اس کی شبانہ روز کی زندگی کا معمول اس انداز سے مختلف ہو۔ جو عام مسلمان کا ہوسکتا ہے لیکن اتنا تو بہر آئینہ مسلّم ہے کہ اس کی دعوت کی بنیاد دو قوموں کے جس عقیدہ پر تھی وہ عین اسلامی انفرادیت کا تقاضا تھا۔ غرض یہ نہیں کہ دونوں کو حق بجانب ٹھہرایا جائے یا دونوں کی غلطی پکڑی جائے۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ دونوں گروہوں کے طرزِ استدلال میں جو منطقی غلطی تھی وہ یہ تھی کہ ان کا دعویٰ تو مخصوص اور متعین تھا لیکن دلیل کی بناوٹ میں عموم کو زیادہ دخل تھا۔ یعنی ثابت وہ یہ کرنا چاہتے تھے کہ ابوالکلامؒ علم وفضل کی جلالتِ شان کے باوجود سیاسیات میں کورے ہیں اور دلیل وہ یہ لاتے تھے کہ عام علماء کے دائرہ معلومات میں سیاسیات کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی اسی طرح دوسرا فریق جواباً کوشش یہ کرتا تھا کہ قائداعظم کی دین سے متعلق عام لاعلمی کا غلط استعمال کرے حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اگر کسی شخص نے اسلامی فنون کو نہیں پڑھا تو وہ اسلام کے متعلق ایک بدیہی اور جانی پہچانی حقیقت سے بھی ناواقف ہے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام ایک الگ ثقافت ہے اور اسلامی قومیت کی بنیاد علیحدہ اور ممتاز عقیدے کی نیو پر استوار ہوتی ہے۔

اب یہ الگ بحث طلب اور دقیق مسئلہ ہے کہ اسلامی قومیت کا دائرہ کسی دوسرے ثقافتی و وطنی دائرے سے بھی کہیں ملتا ہے یا نہیں یا اس کے ملنے اور الگ رہنے کی کیا کیا صورتیں ہیں؟ یہاں اس گتھی کو سلجھانے کا کوئی موقع نہیں غرضیکہ

فریقین نے اثباتِ مدعا کے لئے جو ڈھنگ استعمال کیا اس میں کیا منطقی خامی تھی۔

دوسری مثال

اسی طرح ایک گھپلا وہ ہے جو عام الحاد پسند عناصر کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ دلیل کا انداز یہ ہوتا ہے کہ مذہب کی نظر میں چونکہ مادیت کوئی حقیقت نہیں رکھتی بلکہ اصلی و حقیقی شے روحانیت ہے اس لئے وہ دینی قدروں سے بحث ہی نہیں کرتا یہی نہیں بلکہ وہ طبائع کو ایسے رخ پر ڈالتا ہے کہ جو تعمیر و تمدن کے یکسر منافی ہوتا ہے۔ یعنی ایک مذہبی آدمی کی نفسیات اس طرح کی ہو جاتی ہے کہ وہ آخرت کو اتنا اہم سمجھتا ہے کہ یہاں کی ہر ہر لذت اس کی نظروں میں حقیر ٹھہرتی ہے۔ وہ بھوک کی ہر تکلیف اور جھانجھ کو اس توقع پر برداشت کر لیتا ہے اور اس کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ آسمانی بادشاہت میں جو نعمتیں اس کے دستر خوان پر چنی جائیں گی وہ ان سے کہیں عمدہ ہوں گی۔ اس کی ساری کوشش اس امر پر مرکوز رہتی ہے کہ کسی طرح یہ نفس امارہ ختم ہو جائے۔ اگرچہ اس کے ختم ہونے سے زندگی کی یہ ساری آرزوئیں ہی کیوں نہ مٹ جائیں۔ اس کا ذہنی برتاؤ دنیا کے بارے میں ہمدردانہ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے مذہب کے باب میں یہ تجزیہ عیسائیت اور ہندو مذاہب کے اعتبار سے تو صحیح ہے کہ ان کے ہاں رہبانیت اور تیاگ بنیادی عقیدہ ہے۔ ہندو مذہب کے نقطہ نظر سے یہ ساری کائنات متھ یا باطل ہے۔ اس لئے اس کے تقاضے اور مطالبے بھی درخور اعتناء نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح عیسائیت کے خیال سے اصلی و حقیقی زندگی صرف وہ ہے جس کا آغاز موت کے بعد ہوگا۔ دنیاوی اور جسمانی زندگی کو وہ یک قلم گناہ اور معصیت کی زندگی قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے نجات

کے لئے وہ ان اعمال پر بھروسہ نہیں کرتے جو اس جسم کے ساتھ اس دنیا میں رونما ہوتے ہیں کیونکہ وہ عمل جو جسم کی آلودگیوں سے کسی طرح الگ نہیں ہے پاک کیونکر ٹھہرے گا۔ ان کے نزدیک نجات کا انحصار اعمال پر نہیں کفارہ پر ہے لیکن اسلام کا مزاج اس ذہنیت سے بالکل مختلف ہے وہ تو موت سے پہلے کی زندگی میں اور آخرت و عقبیٰ کی زندگی میں کوئی خط امتیاز نہیں کھینچتا بلکہ اس کے نزدیک تو یہ پہلی زندگی دوسری زندگی کی تمہید یا نتیجہ ہے۔ اسلام جس عقیدے کی تلقین کرتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا اگرچہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ٹھہراؤ کی جگہ نہیں تاہم اس کے فرائض و واجبات میں جن سے ادنیٰ تغافل بھی رہبانیت ہے۔ یہاں رہنے اور بسنے کی کچھ شرائط ہیں جن کو بہر آئینہ ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اسلام تمدنی ارتقاء میں پورا پورا حصہ دار ہے۔ ایک مسلمان کی بہترین آرزو اس کے نزدیک یہی ہے کہ وہ وقنا عذاب النار سے پہلے حسن دنیا کا طالب ہو کہ عروس دنیا کے گیسوئے پیچیدہ کو اگر سلجھا لیا گیا تو آخرت کا مسئلہ آسان ہے۔ جسم ناپاک نہیں یہ دنیا اور اس کی فطرت بھی گناہ و معصیت سے آلودہ نہیں بلکہ ارادہ و شعور اور عمل کے خاص خاص نقشے یا چوکھٹے اسے ناپاک یا پاک ٹھہراتے ہیں غرضیکہ جب اسلام کا معاملہ دوسروں سے مختلف ہو تو اسے منجملہ دوسرے مذاہب کے ایک مذہب قرار دینا اور پھر ترقی کی راہ میں مانع سمجھنا منطقی غلطی ہے۔

تنبیہہ کی ضرورت

یہ اصول منطق میں نہایت پیش پا افتادہ ہے کہ جب دعویٰ خاص ہو تو اس کے ثبوت میں دلیل کو بھی خاص اور متعین ہونا چاہیئے لیکن اگر آپ مباحثات کا جائزہ لیں گے تو وہ دینی ہوں یا سیاسی ان میں اسی مغالطہ کو زیادہ جاری و ساری پایئے گا کہ دعویٰ و

دلیل میں باہم مناسبت نہیں۔ ایک کا مزاج متعین ہے اور دوسرا غیر متعین، عموم کا رنگ لئے ہوئے اس لئے اس پر تنبہ ضروری تھا کیونکہ آئندہ تفصیلات میں اور مخالفانہ انداز بحث میں بار بار اسی غلطی کا ارتکاب دیکھئے گا۔

خلاصہ بحث

ان مقدمات کی وضاحت کے بعد اب ہم اس موڑ تک پہنچ گئے ہیں جہاں سے نفس موضوع کا آغاز ہونا چاہئے اب تک جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ مسائل کے فہم کے لئے سب سے پہلے ذہن کا صاف ہونا ضروری ہے۔ بالخصوص مناظرانہ کج بحثی سے جو غور و فکر کی صلاحیتوں میں ایک طرح کا بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور تنگ نظری اور چھچھورپن سے جو اس کا منطقی نتیجہ ہیں بچاؤ لازمی ہے۔ اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ کسی مسئلہ پر غور کرتے وقت ایک مرتبہ اس کے مجموعی چوکھٹے پر نظر ڈال لی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ دلائل و شواہد کے اس انبار سے خود بخود کیا اثرات ذہن پر مرتسم ہوتے ہیں اور دلائل کی چھان بین میں اس لغزش پر خصوصیت سے نظر رہے کہ دعویٰ و دلیل میں باہم تطابق بھی ہے یا نہیں؟۔ آیئے ختم نبوت کے سلسلہ میں جن آیات و احادیث کو پیش کیا جاتا ہے پہلے بغیر کسی بحث میں الجھے اور بغیر کسی تنقیح میں پڑے ہم یہ دیکھ لیں کہ بحیثیت مجموعی ان سے عقیدہ کے کون کون پہلو روشن ہوتے ہیں اور تصویر کے کون کون رخ سامنے آتے ہیں۔ یعنی ہمارا ذہن بغیر کسی جانبداری کے اور ہماری عام سمجھ بوجھ بغیر کسی مناظرانہ دخل اندازی کے آپ سے آپ کن کن حقائق کو بھانپ لینے میں کامیاب ہوتی ہے۔

ختم نبوت

آیات و احادیث کے حقائق

- آیات
- احادیث
- ان دلائل کی وضاحت
- ایک حقیقت کا دانستہ اعتراف
- لغت کی حقیقت
- فن تفسیر کا اعجاز
- لغت ایک تاریخ
- فقیہ اور مؤرخ میں فرق
- جستہ جستہ حوالے
- جریان نبوت کے دلائل کی نوعیت
- کیا خاتم کے معنی افضل کے ہیں ؟
- جواب کی دو صورتیں
- ایک جاننے کی بات
- حضرت عائشہؓ کا قول
- حجت صرف کتاب اللہ اور سنت
- نظر کی کجی
- نبوت کا اطلاق
- نبوت وولایت میں فرق
- اجراء نبوت پر کن آیات سے استدلال کیا جاسکتا ہے

آیئے ختم نبوت کے سلسلہ میں جن آیات واحادیث کو پیش کیا جاتا ہے پہلے بغیر کسی بحث میں الجھے اور بغیر کسی تنقیح میں پڑے ہم یہ دیکھ لیں کہ بحیثیت مجموعی ان سے عقیدہ کے کون کون پہلو روشن ہوتے ہیں۔ اور تصویر کے کون کون رخ سامنے آتے ہیں۔ یعنی ہمارا ذہن بغیر کسی جانبداری کے اور ہماری عام سمجھ بوجھ بغیر کسی مناظرانہ دخل اندازی کے آپ سے کن کن ئق کو بھانپ لینے میں کامیاب ہوتی ہے۔

آیات

آنحضرت ﷺ خاتم النبیین ہیں

مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط (الاحزاب:٤٠)

”لوگو! محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ (تو زید کے کیوں ہوں؟) وہ تو اللہ کے رسول ہیں۔ اور (خطوں کی مہر کی طرح سب پیغمبروں کے آخر میں ہیں“۔

ساری کائنات کی طرف

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سباء:٢٨)

''اور (اے پیغمبر ﷺ) ہم نے تم کو تمام لوگوں کی طرف بھیجا ہے کہ ان کو ایمان لانے پر خوشخبری سنا دو اور کفر ہونے پر ہمارے عذاب سے ڈرا دو، مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے''۔

سارے تقاضے پورے ہو چکے

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المآئدة :۳)

''اب ہم تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر چکے اور ہم نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور ہم نے تمہارے لئے اسی دین اسلام کو پسند فرمایا''

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (الفرقان۔۱)

''وہ ذات بابرکت ہے۔ جس نے اپنے بندے پر قرآن اتارتا کہ تمام کائناتِ انسانی کیلئے وہ ڈرانے والا ہو''۔

احادیث

قصر نبوت کی آخری اینٹ

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِیْ وَ مَثَلُ الْاَنْبِيَاءِ كَمَثَلِ قَصْرٍ اَحْسَنَ بُنْيَانَهٗ تَرَكَ مِنْهُ مَوْضِعَ لَلَبِنَةِ فطاف به النظار يتعجبون من حسن بينانه الا موضع تلك البنة

فَكُنْتَ اَنَا سَدَدِتُّ مَوْضِعَ الْبِنَةِ خُتِمَ بِیَ الْبُنْيَانِ وَ خُتِمَ بِیَ الرُّسُلِ وَ فِیْ رِوَايَة فَاَنَا اللَّبِنَةَ وَ اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ (بخاری و مسلم)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری اور انبیاء علیہم السلام کی مثال یوں ہے جیسے ایک حویلی ہو جسے کاریگروں نے نہایت عمدگی سے تیار کیا ہو۔ صرف ایک اینٹ کے برابر اس میں رخنہ چھوڑ دیا گیا ہو دیکھنے والے گھوم پھر کر اسے چاروں طرف سے دیکھتے ہوں اور عش عش کر اٹھتے ہوں۔ البتہ ایک اس اینٹ نہ ہونے سے پوری عمارت نامکمل ہو، سو سن لو! کہ یہ ضروری اینٹ جس نے اس رخنے کو بند کر دیا۔ میں ہوں۔ میری وجہ سے اب عمارت مکمل ہوگئی اور نبیوں کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا۔ ایک روایت میں اس طرح آیا ہے، کہ یہ اینٹ مَیں ہوں اور مَیں نبیوں کے سلسلہ کو ختم کرنے والا ہوں۔''

آپ کی چھ خوبیوں میں سے ایک خوبی ختم نبوت بھی ہے

وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فُضِّلْتُ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھ باتوں میں مجھے تمام انبیاء علیہم السلام پر فضیلت بخشی گئی ہے۔

(۱) اُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمَةِ

مجھے جامع کلمات سے بہرہ مند کیا گیا ہے،

وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ

دشمنوں پر میری دھاک بٹھائی گئی ہے۔

(۳) وَاُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِمَ

غنائم کو میرے لئے جائز ٹھرایا گیا ہے۔

(٤) وَجُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَ طَهُوْرًا

پوری زمین کو سجدہ گاہ اور پاک قرار دیا گیا ہے۔

(٥) وَ اُرْسِلَتْ اِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً

میری رسالت کا دائرہ تمام انسانوں تک ممتد ہے۔۔

(٦) وَخُتِمَ بِیَ النَّبِيُّوْنَ

مجھ پر انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ختم کردیا گیا ہے۔

جھوٹے مدعیانِ نبوت آئیں گے لا نبی بعدی کی تصریح

عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ سَيَكُوْنُ فِیْ اُمَّتِیْ كَذَّابُوْنَ ثَلٰثُوْنَ كُلُّهُمْ يَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِیُّ اللّٰهِ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (ابو دائود، ترمذی)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے۔ سب یہ خیال کریں گے کہ وہ اللہ کے نبی ہیں۔ حالانکہ مجھ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا۔ میرے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔“

آنخضرت ﷺ عاقب بھی ہیں

اِنَّ لِیْ اَسْمَاءٌ اَنَا مُحَمَّدٌ وَ اَنَا اَحْمَدُ اِلٰی قَوْلِهٖ وَ اَنَا الْعَاقِبُ وَالْعَاقِبُ الَّذِیْ لَيْسَ بَعْدَهٗ نَبِیٌّ ۔ (بخاری و مسلم)

''میرے کئی نام ہیں۔ میں محمد ﷺ ہوں، احمد ﷺ ہوں اور میں عاقب ﷺ بھی ہوں، عاقب وہ ہوتا ہے جس کے بعد اور کوئی نبی پیدا نہ ہو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جلالتِ شان اگرچہ نبوت کی متقاضی ہے مگر ختم نبوت مانع ہے

لَوْكَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَكَانَ عُمَرَ بْنُ الْخَطَّابِ (ترمذی)

''اگر میرے بعد کسی نبی کا پیدا ہونا مقدر ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ ضرور نبی ہوتے''

امت محمدیہ ﷺ میں آئندہ سلسلہ خلفاء کا ہوگا

كَانَتْ بَنُو اِسْرَئِيْل تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ وَاِنَّهٗ لَا نَبِيَّ وَسَيَكُوْنَ خُلَفَاءُ فَيُكْثِرُوْنَ (بخاری، مسلم، مسند احمد)

''بنی اسرائیل میں تو تدبیر و سیاست کی عنان انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں میں رہی جب ان میں ایک نبی فوت ہوا دوسرے نبی نے اس کی جگہ گھیری۔ اب چونکہ میرے بعد نبی پیدا نہیں ہوں گے اس لئے خلفاء ہوں گے اور کثرت سے ہوں گے۔

حضرت ہارون علیہ السلام کے مقام پر فائز ہونے والا بھی اس لئے نبی نہ ہوسکا کہ اب یہ منصب ہی نہیں رہا

قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ اَنْتَ مِنِّی بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اَلَا اِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِیْ۔

''آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا! تیرا معاملہ میرے ساتھ ویسا ہی ہے جیسا کہ ہارون علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کا، فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی

نہیں"

نبوت ورسالت دونوں کے کواڑ بند ہیں۔

اِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدْ اِنْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ وَلَا نَبِیَّ

(ترمذی، مسند احمد)

"رسالت و نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا، پس اب میرے بعد نہ کوئی رسول پیدا ہوگا نہ نبی"

آنحضرت ﷺ کا ایک نام مقفیٰ بھی ہے

عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُسَمِّیْ لَنَا نَفْسَهٗ اَسْمَاءً فَقَالَ اَنَا مُحَمَّدٌ وَ اَحْمَدٌ وَ الْمُقَفّٰی (مسلم)

"ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت ﷺ نے ہمیں اپنے نام گن گن کر بتائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں محمد ﷺ ہوں، میں احمد ﷺ ہوں اور مقفیٰ ﷺ یعنی آخری ہوں۔

اب رویائے صالحہ کے سوا نبوت کے قبیل کی اور کوئی شے نہیں رہی

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ مَرْفُوْعًا اَنَّهٗ لَیْسَ یَبْقٰی بَعْدِیْ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الرُّؤْیَا الصَّالِحَةَ (نسائی)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نبوت کے قبیل سے میرے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہے گی سوا رویائے صالحہ کے کہ وہ رہے گا۔"

آخری نبی اور آخری امت

عَنْ اَبِی اُمامَةَ الْبَاهِلِیْ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَاَنْتُم اٰخِرُ الْاُمَمِ (ابن ماجه)

"حضرت ابوامامہ باہلی ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا میں تو انبیاء علیہ السلام کے آخر میں آیا ہوں اور تم وہ ہو جو سب امتوں کے آخر میں ہو"

ایک اور تصریح

عَنْ ضَحَاكَ بْنِ نَوْفَلِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ وَلَا اُمَّةَ بَعْدَ اُمَّتِیْ (بیهقی)

"حضرت ضحاک بن نوفل ؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ کہ میرے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا اور میری امت کے بعد کوئی (نئی) امت نہیں ہو پائے گی۔

ایک اور تصریح

اِنِّی اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَمَسْجِدِیْ اٰخِرُ الْمَسَاجِدِ (المسلم)

میں تو انبیاء علیہ السلام کے آخر میں ہوں اور میری مسجد آخری مسجد ہے۔ جو مسجد نبوی ﷺ کے نام سے پکاری جائے گی۔)

تمہیں صرف میری نبوت کے متعلق پوچھا جائے گا

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ وَلَا اُمَّةَ بَعْدَ کُمْ وَ اَنْتُمْ تَسْئَلُوْنَ عَنِّیْ (مسند احمد)

اے لوگو! میرے بعد اور کوئی نبی پیدا ہونے کا اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں تمہیں

میری بابت ہی پوچھا جائے گا۔“

قیامت اور میرے درمیان کوئی نبوت حائل نہیں

عَنْ اُنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بُعِثْتُ اَنَا وَ السَّاعَةُ کَھَاتَیْن (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں اور قیامت یوں اتصال رکھتے ہیں جس طرح یہ دو انگلیاں (یعنی بیچ کی اور شہادت کی انگلی)۔

لوگو! جس طرح تمہارا باپ ایک ہے اسی طرح تمہارا پیغمبر بھی ایک ہے۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاٰبَاکُمْ وَاحِدٌ وَنَبِیُّکُمْ وَاحِدٌ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (کنزل العمال)

اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے۔ تمہارا دین بھی ایک ہے۔ اور پیغمبر بھی ایک کیونکہ میرے بعد اور کوئی نبی نہیں۔“

صرف آنحضرت ﷺ پر ایمان لانا ہے

لَوْکَانَ مُوْسیٰ حَیًّا مَاوَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ (احمد، بیہقی)

”اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری پیروی کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا“

ختمِ نبوت کا منصب پہلے سے تھا

عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِیَةَؓ عَنْ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

اَنَّہٗ قَالَ اِنِّیۡ عِنۡدَاللّٰہِ مَکۡتُوۡبٌ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَ اِنَّ اٰدَمَ لَمُجۡنۡدِلٌ فِیۡ طِیۡنَۃِ

(مشکوٰۃ)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا میرا خاتم النبیین ہونا تو اس وقت سے طے ہے۔ جب آدم علیہ السلام کی مٹی ابھی گوندھی جا رہی تھی۔

پہلے نبی آدم علیہ السلام اور آخری نبی آنحضرت ﷺ

عَنۡ اَبِیۡ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوۡلَ اللّٰہُ صَلَی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ یَا اَبَا ذَرَّ اَوَّلَ الۡاَنۡبِیَاءِ اٰدَمُ وَ اٰخِرُھُمۡ مُحَمَّدٌ (صحیح ابن حبان)

"ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا اے ابوذر سب سے پہلے نبی تو آدم علیہ السلام ہیں اور آخری محمد ﷺ۔

ان دلائل کی وضاحت میں

آیات واحادیث کی یہ فہرست آپ کے سامنے ہے اس میں دیکھنے اور دکھانے کی یہ چیز ہے کہ ایک ہی حقیقت کو قرآن وسنت میں کس کس ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے۔

اس مجموعہ کی ہر ہر آیت اور حدیث اس لائق ہے کہ تنہا اس کو مسئلہ زیر بحث کے لئے استدلال واستنباط کا مبنی قرار دیا جائے۔ تاہم اس کفایت ووضاحت کے باوجود ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ دلائل وشواہد کی پوری بوقلمونی پر نظر ڈالئے۔ تاکہ کوئی گوشہ نظر سے اوجھل نہ ہونے پائے پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ ذوق وفہم کی کجی تاویل وتحریف کے کن کن مورچوں میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔

نگاہ کی چشم کی زلف دو تاکہ
سہے دل جفا کس کس بلا کی

یوں تو جیسا کہ ہم نے عرض کیا ایک ایک آیت وحدیث میں ختم نبوت کی ایسی تعبیر پڑی چھلک رہی ہے کہ شبہ کیلئے کوئی موقع ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر ان سب کو ایک ساتھ جوڑنے اور ملانے میں جو لطف ہے وہ تنہا ایک ایک میں کہاں ہم اس پورے مجموعے کو قائم رکھتے ہوئے ان دلائل کے متعلق صرف اس حد تک مختصراً تعرض چاہتے ہیں۔ جس حد تک بض پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور نظر کے سامنے لانے کا تعلق ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کتاب وسنت میں ان تمام شکوک وشبہات کو کیونکر پہلے سے مرعی رکھا گیا ہے۔ جو کسی وقت دل میں پیدا ہو سکتے ہیں اور پھر کتنی خوبی سے ان کا سد باب کیا گیا ہے۔

پہلے سورۂ احزاب کی اس آیت کو لیجئے جس میں آنحضرت کو ''خاتم النبیین'' کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اور بغیر کسی خارجی شہادت کے اس کی داخلیت پر غور فرمایئے یہاں جس بات کی تردید کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جو جناب زید ؓ کا باپ کہا جاتا ہے وہ غلط ہے، وہ تو صرف آپ ﷺ کے لے پالک تھے۔ اور لے پالک کسی شکل میں بھی حقیقی بیٹے جیسا نہیں ہوتا اس کی تردید کیلئے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ زید تو زید آنحضرت ﷺ تم میں سے کسی مرد کے بھی حقیقی باپ نہیں ہیں۔ نہ سہی پھر اور کیا رشتہ ہے؟ ان کے اور ان کی امت کے درمیان؟ تو فرمایا وہ رسول ﷺ ہیں یعنی روحانی باپ ہیں۔ اس معنی کو کہ نبی قوم کا روحانی باپ ہوتا ہے دوسری جگہ اس طرح فرمایا ہے:۔

وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (الاحزاب:٦)

اور اس کی بیویاںؓ تمہاری مائیں ہیں"

جب پیغمبر امت کے روحانی باپ ٹھہرے تو اس رشتہ کی وضاحت تو ہوگئی جس کا جاننا مقصود تھا اب خاتم النبیین کہہ کر اسی رشتہ کی محکمی اور استواری کی طرف اشارہ فرمایا ہے، کہ پھر یہ باپ بھی ایسا معمولی باپ نہیں جس کی شفقتوں سے تم کسی وقت محروم ہو جاؤ۔ نہیں یہ اس ڈھب کا باپ ہے کہ قیامت تک کیلئے اس کی پدرانہ شفقتیں زندہ رہیں گی، اب اس کے بعد اور کوئی ایسا سرپرست نہیں پیدا ہونے کا جو تمہارا باپ کہلائے کیونکہ یہ آخری نبی ﷺ ہے۔

سورہ سبا کی آیت میں فرمایا "تم کو تمام لوگوں کی طرف بھیجا ہے۔ یعنی اگر قیامت تک کی کائناتِ انسانی کو ایک عصر میں جمع کیا جا سکے تو وہ آنحضرت ﷺ کا عصرِ نبوت ہوگا کافۃ کا لفظ ان سب لوگوں پر بولا گیا۔ جو کسی وقت بھی آپ ا کی دعوت کے مخاطب ہو سکتے ہیں۔ آنحضرت ا کی دعوت کا یہ پھیلاؤ اس لئے ہے کہ دین کے سارے تقاضے ہی مکمل ہو چکے۔ اب کوئی حالتِ منتظرہ نہیں رہی جس کے لئے کوئی نیا نبی پیدا ہو۔ اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت جس کا تذکرہ سورہ مائدہ میں ہوا ہے یہی مطلب ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو دوسری جگہ سورۂ فرقان میں لِلعٰلَمِینَ نَذِیرًا کہہ کر پکارا۔ یعنی آپ ﷺ کی تبلیغ و اشاعت کا دائرہ تمام "عوالم" تک ممتد ہے۔ اور عوالم کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں دنیائے انسانیت کی پوری وسعت سمائی ہے۔ ان آیات کو ان احادیث کے ساتھ ملایئے۔ جن میں ختمِ نبوت پر مختلف طریق سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پہلی ہی حدیث کا صحیحین کی ملاحظہ ہو کہ اپنے مفہوم میں کس درجہ متعین اور واضح ہے۔ یعنی نبوت کو ایک قصر تصور کرنا اور پھر آنحضرت ﷺ کا اپنے کو اس قصر کی آخری

اور تکمیلی اینٹ قرار دینا کتنی عمدہ تشبیہ ہے۔ اس میں غور طلب حقیقت یہ ہے کہ "خُتِمَ بِیَ الْنَبِیّینَ وَ خُتِمَ بِیَ الرّسلِ " فرما کر آنحضرت ﷺ نے لفظ ختم کے موردو معنی کو بالکل واضح فرما دیا ہے۔ یعنی خاتم النبیّین میں جو جہل و نادانی سے ایک بالکل نئے معنی پیدا کئے جاتے تھے ان کا بخوبی انسداد ہو گیا۔

دوسری حدیث سے جو مسلم میں ہے۔ لفظ کافۃ کی تشریح ہوگئی کہ ختم نبوت کے مترادف ہے۔ جیسا کہ حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ وَاُرسِلتُ اِلَی الْخَلْقِ کَافَةً وَخُتِمَ بِیَ النَبِیُون "مجھے تمام دنیا کی طرف رسولؐ بنا کر بھیجا گیا اور مجھ پر انبیاء (علیہم السلام) کا سلسلہ ختم کر دیا گیا"۔

ترمذی کی اس حدیث سے کہ "اگر میرے بعد کسی نبی کا پیدا ہونا مقدر ہوتا تو عمرؓ ہوتے" اس شبہ کا ازالہ ہو گیا کہ نبوت محض ایک فضیلت ہے۔ جو کثرتِ اطاعت یا آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک مخصوص لگاؤ کی وجہ سے عطا ہوتی ہے۔

بخاری و مسلم کی اس حدیث سے کہ کَانَتْ بَنُو اِسرَائِیلَ تَسُوسُمُ الْاَنْبِیَاءُ "بنی اسرائیل میں عنان تربیت انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں میں رہی" اور اب خلفاء ہوں گے کیونکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد دین کی خدمت اور امت کی اصلاح کا انداز کیا ہوگا۔

اسی طرح ان تمام احادیث پر نظر ڈالتے جایئے جس میں " لَا نَبِیَّ بَعْدِی" کی تکرار ہے۔ اور یہ ملاحظہ فرمایئے کہ اس مفہوم کو الفاظ کی الٹ پھیر کے ساتھ کتنے اسالیب میں سمویا ہے؟ اس لئے آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ اس مسئلہ کی وضاحت اس سے زیادہ ممکن ہی نہیں، یوں تاویل کے حدود ملکات کا یہ حال ہے کہ نصوصِ صریحہ کو متشابہات کے تحت میں رکھا جا سکتا ہے اور متشابہات کو اصل کتاب اور ام الکتاب

ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ ہمیں اس موقع پر صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے جو ڈھب کتاب وسنت میں اختیار کیا گیا ہے، کیا انسانی قدرت میں اس سے زیادہ کی استطاعت ہے؟ اور کیا کوئی خلش ایسی ہے جو قرآن وحدیث کی ان تصریحات کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہے یا کوئی شبہ ہے جو دل میں ٹھہر سکتا ہے؟

قرآن وحدیث کے ان تمام دلائل کو میں ایک ہی دلیل قرار دیتا ہوں اور میرا مطالبہ یہ ہے کہ ان پر جب بھی نظر ڈالی جائے تو وہ مجموعی حیثیت سے ہو ایک ایک آیت اور ایک ایک حدیث پر سرجری نہ فرمائی جائے۔ اس اندازِ فکر سے ہم لغت کے تائیدی حوالوں سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتے ہیں تاہم بات تشنہ رہے گی اگر یہ نہ بتایا گیا کہ آئمہ لغت کی اکثریت نے جن کی رائے ہم تک پہنچ سکی ہے لفظ ''ختم'' سے کیا سمجھا ہے۔

ایک حقیقت کا دانستہ اعتراف

یہ واضح رہے کہ ہمارا نقطہ نظر یہاں بھی لغت کی ورق گردانی یا حوالہ بازی نہیں بلکہ ہم اس کو بالکل دوسرے ڈھب سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ نہ جاننے اور اس پر بحث کرنے میں بڑا لطف ہے! بسا اوقات آدمی بات وہی کہہ دیتا ہے جس سے اس کے خصم کا دعویٰ ثابت ہوتا ہے۔ لیکن نادانی وجہل کی وجہ سے یہ نہیں جان پاتا کہ کیونکر؟ آپ نے یہ اکثر دیکھا ہوگا کہ دوران بحث لفظ ''ختم'' کی وضاحت کرتے ہوئے جب متعدد حوالے پیش کئے گئے اور یہ بتایا گیا کہ یہ سب حضرات اس کی ایک ہی تعبیر پر متفق ہیں تو مخالف کیمپ سے اس کا ڈھلا ڈھلایا جواب یہ ملا (اور ان کے ہاں جواب اکثر تیار رہتے ہیں) کہ اس تعبیر پر اتفاق رائے ان کے ہم عقیدہ ہونے کی وجہ سے

ہے ورنہ اس کے تحقیقی معنی وہی ہیں جو ہمارے حضرت پر منکشف ہوئے۔سبحان اللہ! آپ نے غور فرمایا کہ کتنی بڑی بات بے اختیار ان کے منہ سے نکل گئی اور ایسے ڈھنگ سے کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوئی۔بس اسی میں لطف ہے۔

لغت کی حقیقت

اس اجمال کی تفصیل اور اس معمہ کی حیثیت معلوم کرنے کیلئے اس پر غور کرنا ہوگا کہ خود یہ لغت کیا ہے؟ کیا اس کی حیثیت صرف یہ ہے کہ اس میں ہزاروں الفاظ کے معانی سے بحث کی جاتی ہے اور بس (ابو بکر زبیدی کی رائے میں صرف کتاب العین میں جن الفاظ کی وضاحت ہے ان میں وہ الفاظ جن کا استعمال ہوتا ہے۔5620 ہیں) یا اس کی حیثیت اس سے کچھ زیادہ ہے۔سوال یہ ہے کہ آیا خلیل، قطرب، ابن مالک، جمال الدین بن مکرم، ابن ہشام، جوہری اور فیروز آبادی نے صرف الفاظ کی چہرہ کشائی فرمائی ہے یا ان کی کوششوں سے بالواسطہ کچھ حقائق بھی منظر عام پر آئے ہیں۔

فنِ تفسیر کا اعجاز

کہنے کو قرآن حکیم کی تفسیر کے معنی یہ ہیں کہ اس میں مختلف دور کے علماء نے اپنے اپنے فہم اور انداز سے قرآن حکیم کو جو سمجھنے کی کوشش فرمائی ہے اس کی وضاحت ہے۔ اور تحقیق سے دیکھئے گا تو اس کے ساتھ ساتھ مجلدات تفسیر میں ایک اور شے بھی آپ کو ملے گی اور وہ یہ ہے کہ ان مفسرین کے زمانے میں کن علوم کا چرچا تھا کیا کیا مسائل زیرِ بحث تھے اور زیادہ تر دلائل کا کن نکات پر زور رہتا تھا۔گویا عقلی تحریک کی ایک پوری تاریخ صرف ایک اس فنِ تفسیر سے ہی مرتب کی جا سکتی ہے۔یعنی فنِ تفسیر

صرف فنِ تفسیر ہی نہیں بلکہ اسلامی ذہن کی ایک عقلی تاریخ بھی ہے۔

لغت ایک تاریخ

اسی طرح جن لوگوں کی نظر اس حقیقت پر ہے کہ لغت ہر ہر دور کے اطلاقات سے بحث کرتی ہے اور ہر ہر دور کی اصطلاحات وتاویلات کی گرہیں کھولتی ہے انہیں اس حقیقت کو پالینے میں کوئی دشواری نہیں محسوس ہوگی کہ اس کی ایک حیثیت تاریخ کی بھی ہے۔ یہ جہاں یہ بتاتی ہے کہ ایک لفظ کا شجرۂ نسب کیا ہے۔ اس کے کیا کیا استعمالات ومشتقات ہیں وہاں یہ بھی بتاتی ہے کہ زمانے کے مختلف ادوار میں کن کن نئی اصطلاحات کا اضافہ ہوا اور کن کن الفاظ کے معنی میں کیا کیا تغیر رونما ہوا۔ چنانچہ اہل لغت میں ایک گروہ مستقل طور پر وہ ہے جس نے خصوصیت سے انہی تغیرات سے بحث کی ہے جیسے جرجانی کہ انہوں نے ''التعریفات'' اسی غرض سے لکھی یا تھانوی جنہوں نے کشاف اصطلاحات ''الفنون'' جیسی ضخیم کتاب رقم فرمائی جو قریب قریب دو ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ''کلیات ابی البقا'' کو بھی اسی ڈھب کی شے سمجھیے، گویا لغت بھی ایک طرح کی تاریخ ہے۔ جس طرح تاریخ میں سلاطین وملوک اوران کے کارناموں سے بحث ہوتی ہے اسی طرح اس میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کن کن لفظوں کا سکہ کس کس اقلیم معنی میں چلا گیا اور پھر کب وہ متروک ہوگیا۔

اگر لغت کی یہ تعبیر صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر ایک لفظ کی تعیین واطلاق میں فیروز آبادی تک کے لغت نگار متفق ہیں۔ تو گویا نویں صدی کی ابتداء تک یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے اور کوئی معنی ذہنوں میں نہ تھے ورنہ ہر ہر دور میں ذخیرۂ الفاظ میں، مجازات واصطلاحات کا جو اضافہ ہوتا رہا ہے اس کا پورا پورا

ریکارڈ کتبِ لغت میں موجود ہے۔

فقیہ اور مؤرخ میں فرق

یہی بات کہ اہل لغت جب کسی بات پر متفق ہوتے ہیں تو کیا ان کا یہ اتفاق اس نوعیت کا ہوتا ہے جس طرح فقہاء کا ایک مسئلہ پر کہ اس میں عصبیتِ دلائل کا الزام ان پر دھرا جائے، یا وہ اس نوعیت کا ہوتا ہے، جیسے مؤرخین کا، یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ اس کا جواب لغت کی اس تعبیر میں مل جاتا ہے۔ جو ہم نے بیان کی ہے مؤرخین جب متفق ہوتے ہیں تو ان کے اتفاق کا سبب ایک واقعہ ہوتا ہے جس میں تاویل کی کوئی لچک نہیں ہوتی اور ایک فقیہہ جب متفق ہوتا ہے تو اس کا موجب دلیل ہوتی ہے جس کے فہم میں دورائے ہوسکتی ہیں۔ لہٰذا اہل لغت کا اتفاق اس حقیقت کا ہم معنی ٹھہرا کہ تاریخی طور پر اس لفظ کے اطلاق میں گروہ علماء کے درمیان کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا۔

جستہ جستہ حوالے

اس وضاحت کے بعد کہ لغت نگار، صرف لغت نگار ہی نہیں ہوتے مؤرخ بھی ہوتے ہیں جستہ جستہ حوالوں پر غور فرمایئے:

ازہری، ہروی، المتوفی 370ھ کا لغت نویسوں میں جو مقام ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ الفاظ کی چھان بین کی شوق بے پایاں نے انہیں گھر سے نکالا، تو ایک بدوی قبیلہ نے خوبیٔ قسمت یا شومیٔ قسمت سے انہیں پکڑ لیا۔ برسوں انہی کی قید میں رہے اس سے ان کو موقعہ ملا کہ بغیر آمیزش کے بادیہ عرب کی اصلی و حقیقی زبان تک ان کی رسائی ہو۔ انہوں نے ان خانہ بدوشوں کو روزانہ دیکھا ان سے باتیں کیں۔ ان

کے محاورات اور عادات پر غور کیا اور اس کے بعد ''التہذیب'' لکھی اس میں ختم کے متعلق ان کی تصریحات یہ ہیں۔

وَالْخَاتِمُ وَالْخَاتَمُ مِنْ اَسْمَاءِ النَّبِیِّ صَلَی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ فِی التَّنْزِیْلِ الْعَزِیْزِ مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِنْ رِجَالِکُمْ وَ لٰکِنْ رَسُوْلَ اللّٰهِ خَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ، ای اٰخَرُهُمْ۔

خاتِم (بالکسر) اور خاتَم (بالفتح) آنحضرت ﷺ کے اسماء گرامی ہیں اور قرآن میں بھی مذکور ہے۔ کہ ''محمد ﷺ تم میں کسی کے باپ نہیں لیکن رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں'' یعنی سب سے آخر میں آنے والے ہیں۔''

جوہری المتوفی 398ھ لغت وادب کے بہت بڑے امام ہیں۔ انہوں نے بھی تحصیل زبان میں صرف کتابوں پر تکیہ نہیں کیا بلکہ خود گھوم پھر کر زبان کے ایک ایک مرکز تک پہنچے۔ انہوں نے فطرت کے ان بیٹوں سے بھی استفادہ کیا جو کھلے آسمان کے نیچے زندگی بسر کرتے تھے اور ان آئمہ کی صحبت میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا جو بڑے بڑے شہروں میں علم وفن کا درس دیتے تھے۔ یہ اپنی کتاب ''الصحاح'' میں رقم طراز ہیں:۔

خاتمه الشی اخره و محمد صلی الله علیه وسلم خاتمه الانبیاء

''کسی چیز کے خاتم کے معنی آخر کے ہوتے ہیں، انہی معنوں میں آنحضرت ﷺ خاتم الانبیاء ہیں۔''

ابن سیدۃ المتوفی 458ھ ان کی کتاب المحکم گویا لغت وادب کا سمندر ہے۔ ان کے والد ماجد بھی بہت بڑے لغت دان تھے ان کی بلند پائیگی کیلئے یہ جان لینا کافی

ہے کہ صاحبِ قاموس نے اکثر انہی کے معارف سے اپنی بزمِ علم سجائی ہے یہ فرماتے ہیں:۔

"و خاتم کل شئی و خاتمة عاقبته و اخره"

"اور خاتم یا خاتمہ کے معنی انجام و آخر کے ہیں"

جمال الدین بن مکرم المتوفی 711ھ میں متاخرین میں سب سے بڑے امام ہیں۔ان کی کتاب "لسان" کو جو شہرت و قبولیت حاصل ہوئی، یہ واقعہ ہے کہ کسی کو نہیں ہوئی، یہ ادب، تاریخ اور تفسیر کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ اس کی مثال نہیں ملے گی، یہ فرماتے ہیں:۔

خاتمهم او خاتمهم اخرهم "خاتم اور خاتَم دونوں کے معنی آخر کے ہیں"

ابو بکر محمد بن عزیز المتوفی ۳۸۶ھ نے قرآن حکیم کے الفاظ کی شرح لکھی ہے جس میں کوئی پیچیدگی یا ندرت نہیں ہے۔وہ اپنی کتاب "**نزهة القلوب**" میں لکھتے ہیں۔

خاتم النبیین اٰخر النبیین "خاتم النبیین سے مراد آخر النبیین کے ہیں"

الراغب الاصفهانی المتوفی 502ھ بہت بڑے عالم ہیں ان کی کتاب "الزریعه" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شمار "علم الاخلاق" کے اساتذہ میں ہونا چاہئے تھا لیکن انہوں نے چونکہ قرآن حکیم کی تفسیر اور اس کی لغت پر بھی خصوصیت سے قلم اٹھایا ہے۔اس لئے ان کی شہرت لغت نگار ہی کی حیثیت سے ہوئی۔ان کا کہنا ہے:۔

"وخاتمه النبیین لا نهختم النبوت ای تممها بمجیئه"

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیّین اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ آپ ﷺ نے نبوت کو کمال وتمام تک پہنچا دیا۔''

الفیر وزآبادی المتوفی 817ھ تیمور لنگ اور بایزید عثمانی کے معاصر ہیں ان کی کتاب ''القاموس'' ''لسان'' کے بعد دوسری کتاب ہے۔ جس کو قبولِ عام کی سند ملی ہے۔ یہ فرماتے ہیں:

"والخاتم اخر القوم کالخاتم و منه قوله تعالیٰ و خاتم النبیین"

''خاتم کے معنی آخر قوم کے ہیں جیسے مہر، خط کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔ خاتم النبیّین کے بھی یہی معنی ہیں۔''

اس حوالے میں غور طلب حقیقت یہ ہے کہ ''مہر کو جن معنوں میں خاتم سمجھا جاتا ہے۔ وہ ہرگز نہیں ہے۔ جس کو مرزائیت کی اپچ نے پیدا کیا ہے۔ کہ ایسی نبوت آفریں کہ جس سے چھوا جائے وہ نبی ہو جائے۔

سید مرتضٰی الزبیدی المتوفی 1205ھ میں ''قاموس'' کے مشہور شارح ہیں لین نے اپنی ڈکشنری میں زیادہ تر استفادہ انہیں سے کیا ہے۔ ان کی تصریحات ملاحظہ ہوں:۔

ومن اسمائه علیه السلام الخاتم و الخاتم و هو الذین ختم النبوة بجیئه ''اور آپ ﷺ کے ناموں میں خاتم وخاتَم بھی ہے۔ اور وہ وہ ہے جس نے اپنی آمد سے نبوت کے آئندہ امکانات کو روک دیا''

ابوالبقاء الحسینی المتوفی 1094ھ انہوں نے مصطلحات عربیہ پر ایک مستند کتاب لکھی ہے۔ جو ''کلیات ابی البقاء'' کے نام سے مشہور ہے اس میں یہ صراحت سے مذکور ہے کہ

والخاتم اخر القوم کالخاتم و منه قوله تعالٰی و خاتم النبیین" خاتم کے معنی آخر قوم کے ہیں جیسے مہر، خط کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔ خاتم النبیین کے بھی یہی معنی ہیں۔

بحث کو ختم کرنے سے پہلے فرزدق کے اس مشہور قصیدے میں سے ایک شعر جو اس نے ہشام بن عبدالملک کے سامنے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے جلیل القدر بیٹے زین العابدین رضی اللہ عنہ کی تعریف میں پڑھا۔ ہم پیش کرنا چاہتے ہیں جو اس بات میں بیت القصیدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قصہ دلچسپ ہے سن لیجئے۔

ہشام شام کے امراء کے لاؤلشکر کے ساتھ اپنے بھائی ولید کی خلافت میں حج کو روانہ ہوا جب مکہ پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک شخص بہت پاکیزہ نہایت بزرگ، نہایت خوبصورت اور وجیہ مناسکِ حج کی ادائیگی میں مصروف ہے اور لوگوں کے جلال واحترام کا یہ حال ہے کہ وہ جدھر کا رخ کرتا ہے دورویہ کھڑے ہو جاتے ہیں ہشام کے ساتھیوں نے یہ کیفیت دیکھی تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ فرزدق آگے بڑھا اور یہ قصیدہ بطور تعارف پیش کیا۔

هذاابن فاطمه ان کنت جاهله
بجده انبیاء الله قد ختموا

"یہ وہ شخص ہے بطحاء کی زمین جس سے آگاہ ہے، اسے بیت اور حرم وغیرہ کے لوگ بخوبی جانتے ہیں"

هذا ابن فاطمه ان کنت جاهله بجده انبیاء الله قد ختموا

"اگر تمہیں علم نہ ہو تو جان لو کہ یہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نونہال ہے۔ یہ وہ ہے جس کے نانا ﷺ پر انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ختم ہوا۔"

جریانِ نبوت کے دلائل کی نوعیت

گزشتہ صفحات میں ہم نے جس انداز اور نہج سے ختمِ نبوت کے دلائل پر غور کیا ہے اسی ڈھب سے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جریانِ نبوت کے دلائل کی قدر و قیمت کیا ہے جس طرح ختم نبوت سے متعلق تمام آیات واحادیث پر ہم نے مجموعی نظر ڈالی ہے ٹھیک اسی طرح ہماری یہ خواہش ہے کہ ان تمام دلائل کو بھی ایک جا اور ایک ساتھ اکٹھا دیکھا جائے، جو جریانِ نبوت سے متعلق ہیں اور پھر یہ بتایا جائے کہ ان سے جو تاثرات ذہن بغیر مناظرانہ کرید اور اپچ کے از خود حاصل کرتا ہے وہ کیا ہیں، آیا ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی نبوت ورسالت کا چشمہ فیض جاری ہے؟ اور نبوت ورسالت کے کچھ اور بھی محل ہیں جن کی تعمیر ہونے والی ہے؟ یا یہ کہ ان دلائل سے قطعی کسی نبوت جدیدہ یا رسالتِ مستانفہ کا سراغ نہیں ملتا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان آیات میں جنہیں ختمِ نبوت کے جواب میں پیش کیا جاتا ہے ان میں فیوضِ رشد وہدایت کا تذکرہ ہے جن کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا اور آنحضرت ﷺ کی ذات ستودہ صفات پر ان کی تکمیل ہوگئی۔ یا کچھ نئے انوار وتجلیات کی خبر ہے۔ جن سے بنی آدم کی آنکھیں روشن ہونے والی ہیں۔ یعنی تحقیق طلب نکتہ یہ ہے کہ ان آیات کو جن میں کسی ہدایت کے آنے کی حکایت ہے اس ہدایت پر محمول کیا جائے گا جو آچکی۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرة) یا کسی نئی ہدایت پر چسپاں کیا جائے گا؟ جواب تک منظرِ عام پر نہیں آئی۔

کچھ اور ضروری بحثیں بھی ہیں جو اسی سلسلے سے متعلق ہیں، انشاء اللہ وہ خاص ترتیب کے ساتھ آگے آئیں گی۔ سرِ دست ہمیں کچھ ایسے اعتراضوں کا سامنا

ہے۔جن کے ذوقِ ادب کی محرومیوں اور مطالعہ کی کمی نے پیدا کیا ہے، پہلے ان کے جواب پر غور فرمالیجئے پھر آگے بڑھیں گے۔

کیا خاتم کے معنی افضل کے ہیں؟

کہا جاتا ہے کہ خاتم وآخر کے معنی افضل وبہتر کے ہیں، چنانچہ ہم برابر اس طرح کی ترکیبیں سنتے اور استعمال کرتے ہیں کہ فلاں خاتم الشعراء ہے، فلاں خاتم المحدثین ہے۔علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ امام ابن تیمیہؒ کے حق میں فرمایا ہے کہ یہ آخر المجتہدین ہیں۔ان سب استعمالات میں کہیں یہ مقصود نہیں ہوتا کہ اب شعروسخن کی صلاحیتیں ختم ہوگئی ہیں یا اب کوئی محدث پیدا نہیں ہوگا یا یہ کہ ابن تیمیہؒ پر اجتہاد واستنباط کے تقاضے اس طرح مکمل ہوگئے ہیں کہ ان کے بعد کوئی اجتہاد کا دعویٰ نہیں کرسکے گا۔

جواب کی دوصورتیں

بات زیادہ الجھاؤ کی نہیں، جواب کی ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ باعتبار زاعم کے ہے یعنی جب ایک شخص کسی کو خاتم الشعراء کہتا ہے تو وہ واقعی یہ سمجھتا ہے کہ اس کے بعد شعر کہنا بے کار ہے ورنہ مدحت میں غلو جو مقصود اور مبالغہ کی جان ہے بے معنی ہوکررہ جاتا ہے۔اسی طرح خاتم المحدثین اور آخر المجتہدین کے الفاظ استعمال کرنے والا یہی سمجھتا ہے کہ محدثیت واجتہاد کی یہ آخر کڑیاں ہیں ورنہ یہ ترتیب پھسپھسی اور بے مزہ ہوگی۔کیونکہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ان الفاظ کے استعمال سے ایک گونہ فضیلت ثابت کرنا ہی مقصود ہے تو ان میں زور کیا خاک باقی رہے گا۔

اب یہ کہنے والا یا زاعم نہ تو پیغمبر ہے اور نہ یہ کوئی پیشین گوئی ہی ہے بلکہ مدح کا ایک انداز ہے، جو اختیار کیا گیا ہے۔ اس لئے اگر اس کے بعد بھی کوئی شخص شعر وسخن کے ذوق سے بہرمند ہو جاتا ہے یا محدثیت واجتہاد کی مسند پر بیٹھ جاتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسرا انداز یہ ہے کہ مجاز وحقیقت کے استعمال میں فرق ہے، جب کوئی لفظ اپنے موضوع لہ، معنوں میں استعمال ہوگا تو وہ حقیقی ہوگا۔ اور جب کسی مناسبت سے ہوان معنوں میں استعمال نہ ہو سکے گا تو یہ مجاز ہوگا۔ مثلاً شیر کا ایک استعمال یہ ہے کہ وہ ایک درندے کا نام ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ اس کے معنے بہادر شجاع کے ہیں۔ پہلا استعمال حقیقی ہے۔ اور دوسرا مجازی۔

ایک جاننے کی بات

یہاں یہ بات جاننے کی ہے کہ کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتے وقت مجازی معنوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے بخلاف مجاز کے کہ اس میں تنہا مجازی معنی ہی پائے جاتے ہیں۔ جیسے شیر کہ یہ جہاں ایک درندہ ہے بہادر اور شجاع بھی ہے لیکن جب اس کا اطلاق کسی انسان پر ہوگا تو اس کے معنی صرف بہادر کے ہوں گے، حقیقی شیر کے نہیں، اس خیال سے خاتم النبیین کے معنے اگر حقیقی لئے جائیں تو اس میں یہ خوبی ہوگی کہ فضیلت کے معنے از خود اس میں آجائیں گے بخلاف مجاز کے، کہ اس میں ختم نبوت کی وہ تعبیر نہ آسکے گی جس کی تائید قرآن وحدیث اور لغت و ادب کے حوالوں سے ہوتی ہے۔ پھر مجازی معنے وہاں مراد ہوتے ہیں جہاں حقیقت متعذر ہو جہاں یہ حال ہو کہ حقیقت کی تائید میں قرائن ہی نہیں، شواہد ودلائل کا ایک انبار ہو جیسا کہ آپ دیکھ چکے، وہاں مجازی معنوں کیلئے کوئی وجہ جواز ہی پیدا نہیں

ہوتی۔

حضرت عائشہؓ کا قول

درمنثور کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کا ایک قول پیش کیا جاتا ہے کہ قولوا خاتم النبیین ولا تقولوا لانبی بعدہ " تم خاتم النبیین تو کہو! لیکن یہ نہ کہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا" اس کا دوٹوک جواب تو یہ ہے کہ یہ قول ہی مردود ہے۔ اس کی کوئی سند مذکور نہیں پہلے تو یہ ثابت کیجئے کہ کتب حدیث میں یہ کہیں مذکور ہے اور اس کی کوئی محدثانہ قدرو قیمت ہے پھر گفتگو آگے بڑھے گی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ کیوں نہ اس کا صحیح محل تلاش کیا جائے۔ جب ختم نبوت اور لا نبی بعدی، ایک مضبوط سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ جس کا متعدد پیرایہ ہائے بیان سے اثبات ہو چکا ہے۔ تو اس کے معنی قطعی ان کے منافی نہیں ہو سکتے۔ بات واضح ہے۔ حضرت عائشہؓ چونکہ اس حقیقت سے آگاہ تھیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لانے والے ہیں اس لئے وہ احادیث کے اطلاق میں اتنی سی گنجائش چاہتی ہیں۔ کہ ان کی آمد پر کوئی اثر نہ پڑے اور اس کا ثبوت یہ حدیث ہے۔ جو ان سے مرفوعاً مروی ہے:۔

عَنْ عَائِشَةَ النَّبِیّ صَلَی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ لَایَبْقٰی بَعْدَهٗ مِنَ النَّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْمُبَشِّرَاتِ قَالَ اَلرُّؤْیَا اَلصَّالِحَه یَرَالْمُسْلِمُ اَوْ یُرَیٰ لَهٗ (مسند احمد)

"حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کے

بعد بجز مبشرات کے ثبوت میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یہ مبشرات کیا ہیں فرمایا صالح خواب جو مسلمان خود دیکھے یا کوئی اس سے متعلق دوسرا مسلمان دیکھے۔"

حجت صرف کتاب اللہ اور سنت

حضرات صوفیاء کے بعض اقوال بھی اس سلسلہ میں پیش کیے جاتے ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ نبوت کی سلسبیل جاری ہے۔ اور امتِ محمد ﷺ میں اب بھی ایسے لوگ ہو سکتے ہیں۔ جو ریاضت و تزکیہ نفس کی مشقتوں کو جھیل جھیل کر اپنے دل کے آئینہ کو اتنا چمکا لیں کہ ان پر فیوض نبوت کا پرتو پڑ سکے۔ اور جو اپنی صلاحیتوں کو اس درجہ سنوار لیں کہ مقام نبوت کے تمام انوار و تجلیات ان کو حاصل ہو جائیں۔

اس سے پہلے کہ ان اقوال کا صحیح صحیح محل ڈھونڈا جائے اور ان کے معانی کی ٹھیک ٹھیک تعیین کی جائے۔ یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ جہاں تک حجیت و استدلال کے دائروں کا تعلق ہے وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے آگے نہیں بڑھتے۔ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کے مکلّف تو ہیں جو قرآن و حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اس کو مانیں، اس کی وضاحت کریں اور اس پر جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب دیں۔ لیکن ہمارے لئے یہ سخت دشوار ہے کہ امت میں ہر ہر شخص کے اعتقادات کو حق بجانب ثابت کریں بالخصوص جب سوال بنیادی عقیدوں کا ہو تو اس کیلئے تو لازماً ہمیں فکر و نظر کی عنان کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہی موڑنا چاہئے اور اس سے بالکل بے پرواہ ہو جانا چاہئے کہ کون کون کیا کیا کہتا ہے کیونکہ دین صرف اللہ کے احکام اور رسول اللہ ﷺ کے عمل و اسوۂ سے تعبیر ہے۔ اس

کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ بشرطِ صحت لائق صد احترام ہے اور بصورتِ اختلاف و عدمِ صحت، محض اقوال الرجال۔

نظر کی کجی

ہماری نظر میں یہ ٹیڑھ ہے کہ جو عقائد ہمیں کتاب اللہ میں تلاش کرنے چاہئیں اور جن تصورات کی پرچول ہمیں چمنستانِ نبوت میں کرنا چاہئے ان کو ہم ان لوگوں کی کتابوں میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں جو ہر وقت غلطی کر سکتے ہیں، جن کا پائے استقلال ہر جگہ پھسل سکتا ہے اور جن کی عصمت کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کبھی حامی نہیں بھری۔

نبوت کا مسئلہ ایسا نہیں جسے امام عبدالوہاب شعرانی یا ابن العربی کے سپرد کیا جا سکے یہ اصولاً نصوص چاہتا ہے۔ کتاب اللہ اور حدیث کی واضح شہادات چاہتا ہے۔ یعنی اس مسئلہ کا مزاج اصولی اور بنیادی ہے۔ یہ استدلال و استنباط کی چیز نہیں بلکہ ایسا عقیدہ اور تصور ہے جس کی تائید قرآن حکیم کی کھلی کھلی اور ناقابلِ تاویل آیات سے ہونی چاہئے۔ یہی نہیں بلکہ اس عقیدہ کی اہمیت کا یہ تقاضا ہے کہ یہ عصر صحابہؓ میں مشہور ہوا اور صحابہؓ اور ان کے بعد تابعین رحمہم اللہ اور بڑے بڑے آئمہ اس کی حقانیت سے اتنا ہی آگاہ ہوں جتنا توحید قیامت اور عبادات کے مشہور مسائل سے، یہ کتنی مضحکہ خیز حرکت ہے کہ ختم نبوت ایسی حقیقت کیلئے جس کی قرآن میں وضاحت ہے جو حدیث میں صراحت سے مذکور ہے۔ ہم مجبور ہوں کہ فکر و استدلال کی متعین راہوں سے ہٹ کر ادھر ادھر دیکھیں اور چند لوگوں کے اقوال پر اس کی بنیاد رکھیں۔

ان اقوال کی حیثیت ہمارے ہاں صرف اتنی ہے کہ یہ جن بزرگوں کی طرف

منسوب ہیں ہم ان کے مرتبہ علمی اور مقام عملی کے قائل ہیں اور مانتے ہیں کہ ان کے عقائد امت کے مسلمات سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ بالخصوص ایسے مسائل میں جن کی حیثیت اصول اور بنیاد کی ہے۔ امت کے ذہن سے علیحدہ ان کا ذہن ہونا قرینِ عقل نہیں۔ اس مفروضے کی روشنی میں ہم ان کے اقوال پر نظر ڈالیں گے۔

ایک اور بات صوفیا کے سلسلہ میں یہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان میں بعض لوگ ایسے ہیں، جن پر سکر و جذب کی کیفیتیں اتنی غالب رہتی ہیں اور عمل و صحوا اتنا مغلوب کہ وہ استواری کے ساتھ دینی مسائل پر غور کر ہی نہیں سکتے ان کے شطحیات کے ہم قطعی پابند نہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کی ذمہ داری صرف ان پر ہے۔ ہم اتنا کہہ کر عہدہ برا ہو جائیں گے۔ کہ ان سے بادی النظر میں جو معنی ذہن میں آتے ہیں وہ ظاہر شریعت کے ساتھ میل نہیں کھاتے اور یہ کہ ان کا معاملہ اللہ سے ہے۔

نبوت کا اطلاق

باقی رہے وہ صوفیا اور بزرگ جو صحو و استحضار سے بہرہ مندہ ہیں تو وہ البتہ ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ ہم نے جہاں تک ان کی کتابوں پر غور کیا ہے کہیں ایک مقام بھی ان میں ایسا نہیں ملا جس میں یہ مذکور ہو کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی شخص اپنے الہامات یا بزرگی کے باعث اس لائق ہے کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہو۔ جو صاحبِ دعوت ہونے کا استحقاق رکھتا ہو جو ایمان و کفر کے درمیان حدِ فاصل ہو جس کا ماننا تقاضائے اسلام ہو اور جس کا انکار نفسِ اسلام کے انکار کے مترادف ہو یاں وہ ولایت کو البتہ جاری سمجھتے ہیں۔ اور پھر ولایت ہی کے ایک پہلو کو نبوت سے تعبیر کرتے ہیں علمی اصطلاح میں آپ یوں سمجھئے کہ نبوت کا ایک اطلاق ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ

ولایت کی قسم ہے۔ رسالت کی قسم نہیں لہٰذا جب وہ یہ کہتے ہیں کہ نبوت کے فیوض جاری ہیں تو ان کی مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ ولایت جاری ہے۔ پھر اس نبوت کو جس کو نبوت ولایت کہنا چاہئے اس نبوت سے جس کا ماننا ہر مسلمان پر ضروری ہے لفظ تشریع سے جدا کرتے ہیں۔ یعنی ایک نبوت وہ ہے جو اس درجے کی ہے۔ کہ کوئی دوسرا شخص اس کو ماننے کا مکلّف نہیں اور ایک وہ ہے جس کا ماننا ہر شخص پر شرعاً ضروری ہے۔ یہ دوسری قسم کی نبوت ان کے ہاں نبوت التشریع کہلاتی ہے۔ امام شعرانیؒ فرماتے ہیں۔

اَلْفَرْقُ بَیْنَهُمَا هُوَ اَنَّ النَّبِیُّ اِذَاَلْقٰی اِلَیْهِ الرُّوحِ شَیْئًانِ اِقْتَصَرَ بِهٖ ذٰلِكَ النَّبِیَّ عَلٰی نَفْسِهٖ خَاصَةً وَیَحْرِمُ عَلَیْهِ اَنْ یَّبْلُغَ غَیْرَهٗ ثُمَّ اِنْ قِیْلَ لَهٗ بَلِّغَ مَا اَنْزَلَ اِلَیْكَ اِمَّا لِطَائِفَةٍ مَخْصُوْصَةٍ كَسَائِرِ الْاَنْبِیَاء اَوْ عَامَةً لَمْ یَكُنْ ذٰلِكَ اِلَّا لِمُحَمَّدٍ سُمِیَ بِهٰذَا الْوَجْهِ رَسُوْلًا وَ اِنْ لَمْ یَخُصَّ فِیْ نَفْسِهٖ بِحُكْمٍ لَا یَكُنْ لِمَنْ اَلَیْهِمْ فَهُوَ رَسُوْلٌ لَا نَبِیٌّ وَ اَعْنِی بِهَانَبُوَّةَ التَّشْرِیْعِ الَّتِیْ لَا یَكُوْنَ لِلَاَ وْلِیَاءِ (الیواقیت الجواہر صفحہ:۲۵)

دونوں میں فرق یہ ہے کہ نبی پر جب وحی ہوتی ہے۔ تو وہ اس کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھتا ہے۔ اس کے لئے یہ ناجائز ہے کہ دوسروں کو ان الہامات کی دعوت دے اور اگر اس کو ان الہامات کی دعوت پر مامور کیا گیا ہے تو وہ (ہماری اصطلاح میں) رسول ہے چاہے اس کا حلقہ چند لوگوں تک وسیع ہو، چاہے ساری دنیا تک ممتد ہو اور ایسا رسول تمام کی رشد و ہدایت کیلئے مامور ہو بجز آنحضرت ﷺ کے اور کوئی نہیں آپ ﷺ کو اسی مناسبت سے رسول کہا گیا ہے۔ کہ آپ ﷺ نے کسی حکم کی تبلیغ کو اپنی ذات تک محدود کر کے نہیں رکھا یہی نبوت تشریعی ہے جو

اولیاء کو حاصل ہوتی''۔

اس پوری عبارت پر غور فرمایئے۔ خصوصاً خط کشیدہ الفاظ پر، تو یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ صوفیا کے ہاں نبوت کا ایک اپنا اطلاق ہے۔ جس میں اولیاء امت داخل ہیں۔ ورنہ جہاں ایسی نبوت کا تعلق ہے۔ جس کا ماننا دوسروں کیلئے ضروری ہے اور جس کو وہ رسالت سے تعبیر کرتے ہیں۔ تو حضرت امام کے نزدیک ان کے دونوں کواڑ آنحضرت ﷺ پر بند ہیں۔

قد ختم الله تعالى بشرع محمد صلى الله عليه وسلم جميع الشرائع ولا رسولبعده يشرع ولا نبى بعده يرسل اليه بشرع يتعبدبه فينفسه انما يتعبد الناس بشريعةه الى يوما القيمه

(اليواقيت الجواهر جلد٢ ص ٣٧)

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی شریعت سے جملہ شرائع کو ختم کر دیا ہے اب نہ تو کوئی نبی آنے والا ہے۔ اور نہ کوئی رسول بھیجا جائے گا۔ جسے شریعت سے بہرہ مند کر کے مبعوث کیا گیا ہو۔ اب تو قیامت تک کیلئے لوگ آنحضرت ﷺ کی شریعت ہی کو ماننے کے پابند ہیں۔''

اب رہی یہ بحث کہ صوفیائے کرام نے نبوت کے معنی میں یہ توسیع کیوں فرمائی۔ کہ اس کا اطلاق اولیاء پر بھی ہو سکے تو یہ ایک لطیف بحث ہے۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری صوفیاء کے اس تصور پر عائد ہوتی ہے۔ جو انہوں نے نبوت سے متعلق قائم کیا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ کمالات نبوت ایسی چیز ہے جو سعی اور کوشش سے حاصل ہو سکتی ہے زہد و ریاضت اور اللہ کی خوشنودی کے حصول میں جدوجہد انسان کو اس حد تک پہنچا دیتی ہے کہ اس کا آئینہ دل اتنا مجلّا اور شفاف ہو

جائے کہ غیب کے انوار وتجلیات کی جھلک اس پر منعکس ہو ان کا دل مہبط وحی قرار پائے اور اس کے کان طرح طرح کی آوازیں سنیں۔ یعنی مقام نبوت سے مراد عمل و فکر کی وہ صلاحیتیں ہیں جو بشریت کی معراج ہیں ان تک رسائی کے دروازے امت محمدیہ ﷺ پر بلا شبہ کھلے ہیں شوقِ عبودیت اور ذوقِ عبادت شرط ہے۔ جو بات ختمِ نبوت کی تصریحات کے بعد ہماری دسترس سے باہر ہے وہ نبوت کا حصول ہے کہ اس کا تعلق یکسر اللہ تعالیٰ کے انتخاب سے ہے۔ یعنی یہ اس پر موقوف ہے کہ اس کی نگاہِ کرم اس عہد جلیلہ کیلئے اپنے کسی بندے کو چن لے جس میں نبوت کی صلاحیتیں پہلے سے موجود ہوں اور جو مقام نبوت پر پہلے سے فائز ہو اب چونکہ نامزدگی کا یہ سلسلہ بند ہے اس لئے کوئی شخص ان معنوں میں تو نبی ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کہ اس کا ماننا دوسروں کیلئے ضروری ہو اور اس کے الہامات دوسروں پر شرعاً حجت ہوں۔ البتہ مقامِ نبوت یا نبوت کی صلاحیتیں اب بھی حاصل ہوسکتی ہیں۔ نبوت کے اس تصور سے چونکہ نبوت مصطلحہ اور ولایت کے اس مقام میں بجز نامزدگی کے اور کوئی بنیادی فرق نہیں رہتا اس لئے وہ حق بجانب ہیں کہ اس کو بھی ایک طرح کی نبوت قرار دیں کہ دونوں فطرت وحقیقت کے اعتبار سے ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور امتیاز جو ہے وہ صرف رتبہ واعزاز کا ہے نوعیت کا نہیں یا یوں کہئے کہ اصطلاحی ہے۔

نبوت وولایت میں فرق

ہمارے نزدیک یہ تصور نبوت کا درست نہیں۔ ولایت ونبوت میں جو فرق ہے، وہ اس طرح کا نہیں ہے جیسے ایک عالم اور حکیم میں ہوتا ہے، یا فقیہہ ومجتہد میں ہوتا ہے بلکہ یہ فرق نوعیت کا ہے۔ مدارج یا رتبہ کا نہیں۔ نبوت اپنے ماخذ کے اعتبار

سے جس سے وہ براہ راست استفادہ کرتی ہے۔ اپنی صلاحیتوں کے نقطہ نظر سے اور اپنے طریق کار کے لحاظ سے ولایت سے یکسر مختلف شے ہے۔ نبوت کا ماخذ منشاء الٰہی ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ (النجم۔۳۔۴) اور ولایت کا ماخذ کتاب وسنت ہے۔ اور وہ واردات و احوال جن کو الہامات ووحی سے تعبیر کرتے ہیں ایسے نہیں ہیں کہ ان پر وثوق کیا جا سکے۔ ابھی دل کا سائنس اتنا ترقی پذیر نہیں ہوا کہ الہام ووحی کی پوری پوری تشریح ہو سکے تاہم اتنا تو بہرآئینہ طے ہے کہ اس وحی میں وہ قطعیت نہیں جو وحی نبوت کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ یہاں یہ احتمال برابر کھٹکتا ہے کہ دل تک وحی والہام کی لہروں اور موجوں کے لے جانے والے کہیں یہ خود حضرتِ دل ہی نہ ہوں، کہیں یہ وجدان کی کارفرمائی نہ ہو کہ کشوف کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ دل کی پہنائیاں اس درجہ وسیع اور ناقابلِ فہم ہیں کہ یہ سب کچھ ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود صوفیائے کرام نے اپنے الہامات کو دوسروں کیلئے حجت نہیں ٹھہرایا۔

صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی نبی ظاہر و باطن کے اس حسن و جمال اور اعتدال وتوازن کو لے کر آتا ہے کہ غیر نبی کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہو پاتا۔ یعنی یہ وہ حضرات ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ انتخاب اول روز سے چن لیتی ہے۔ غیر معمولی صلاحیتوں سے انہیں بہرہ مند کرتی ہے اور تربیت کا وہ اہتمام کرتی ہے جو دوسروں کو میسر نہیں ہوتا اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ط (الانعام:۱۲۴)

نبوت کا طریقِ کار یہ ہے کہ ایک شخص اپنے نفس کی فکر سے فارغ اس غم میں گھل رہا ہے کہ دوسروں کی اصلاح کیونکر کی جائے اور ولی بے چارہ اپنے ہی ہموم و افکار سے مخلصی نہیں حاصل کر سکا۔ نبی ایک روشنی رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس سے

دنیا بھر کی تاریکیوں کو دور کرے۔ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (البقرۃ:۲۵۷) ''اوران کو تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں داخل کرتا ہے۔''
اور ولی کتاب وسنت کی روشنی تو رکھتا ہے لیکن نفس وعمل کی تاریکیوں سے برابر دوچار ہے۔

اجرائے نبوت پر کن آیتوں سے استدلال کیا جاتا ہے

اب ذیل میں ہم ان تمام آیات کو درج کرتے ہیں۔ جن پر اجرائے نبوت کی عمارت چنی گئی ہے۔ یہاں خصوصیّت سے یہ اصول مدِ نظر رکھنا چاہئے کہ جو بات ما بہ النزاع ہے وہ مطلقاً اجرائے نبوت یا اس کے متعلقات نہیں۔ کیونکہ نبوت کی گاڑی تو بہر آئینہ ہزاروں برس چلتی ہی رہی ہے، بلکہ وہ نبوت ہے جو آنحضرت ﷺ کے بعد ہو۔ یعنی ثابت یہ کرنا ہے کہ دین مکمل نہیں اور ابھی کئی اور راز ہیں جو سینہء جبریل میں پنہاں ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ اسلام ہی آخری دین نہیں، نبوت، وحی اور الہام کی اور کئی کڑیاں بھی ہیں جو انسان کے سامنے آنے والی ہیں۔ ظل اور بروز اور رنگ وانعکاس کے ہم قائل نہیں یہاں تقسیم دوٹوک ہے یا ایک نبی ہے یا وہ نبی نہیں ہے اور اگر باوجود ادعائے نبوت کے وہ نبی نہیں ہے تو صرف یہی نہیں کہ نبی نہیں ہے۔ مکار ہے۔ اور اگر مکار نہیں ہے تو بے وقوف ہے جب صاف، روشن اور واضح راستوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک شخص ٹیڑھی اور خمدار گلیوں میں چکر لگاتا ہے۔ تو وہ چور ہے۔ بات صرف اتنی ہی ہے۔ کہ اسلام اپنے تقاضوں کے ساتھ مکمل ہو چکا ہے۔ اور سینہء جبریل کے تمام راز ربوبیتِ کبریٰ نے اگلوا لئے ہیں۔ اب جہاں تک انسانی رشد و ہدایت کا تعلق ہے۔ کوئی نئی بات کہنے کی نہیں

رہی اور نہ کوئی راز و معمہ ہی باقی رہ گیا ہے۔ جس کے حل و القاء کیلئے جبریل کو سینہ رسالت کی تلاش ہو۔

خیر یہ بحث تو آئندہ سطور میں آئے گی، سردست صرف یہ کہنا ہے کہ ان آیتوں کو بار بار پڑھیے اور دیکھئے کہ ان میں کہیں یہ موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کے بعد بھی رسالت کا باقاعدہ سلسلہ جاری ہے، یا وحی و الہام کے کواڑ کھلے ہیں۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ دعویٰ و دلیل میں مطابقت ہونا چاہئے اور استدلال و استنباط کی اس ہمہ گیر لغزش سے بچنا چاہئے کہ عمومات سے مخصوص و متعین دعویٰ ثابت کیا جائے۔ بات بالکل واضح ہے اگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی انسان کو دین کی جامعیت و اکملیت کا اطمینان حاصل نہ ہو اور وہ برابر نئی نئی نبوتوں اور رسالتوں کا منتظر رہے یا دین کا مزاج ہی ایسا ہے کہ ہر ہر آن میں اس میں تغیر و تبدیلی کی گنجائش نکلتی رہتی ہے تو اس کو بڑی وضاحت اور تعین کے ساتھ قرآن میں مذکور ہونا تھا۔ ظل و بروز کے چور دروازوں کی حاجت نہیں۔ جہاں ختمِ نبوت کی کھلی کھلی آیتیں ہیں وہاں اجرائے نبوت کی آیتیں بھی اتنا ہی بیّن اور واضح ہونا چاہئیں تھیں۔ بلکہ صحیح موقف تو یہ ہے کہ ختم نبوت اور اس کے متعلقات کو اور ان تمام پیرایہ بیان کو ہونا چاہئے تھا جن سے ختم نبوت کا مسئلہ پر پوری پوری روشنی پڑتی ہے۔

کیونکہ دو ہی تو شرعاً موقف ہو سکتے ہیں یا نبوت آنحضرت ﷺ پر ختم ہے اور یا ختم نہیں ہے۔ بیچ کا کوئی رستہ نہیں۔ ظل و بروز کی بحث قطعاً غیر متعلق اور عجیب ہے اگر ختم نبوت کا مسئلہ صحیح ہے اور واضح ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے تو پھر اللہ کی کتاب میں اجرائے نبوت کی ٹٹول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر یہ چاہئے کہ

اطمینان سے کتاب وسنت پر عمل کرتے جائیں اور کسی دبدبہ کو دل میں نہ لائیں۔ اور اگر نبوت کا سلسلہ جاری ہے تو پھر یہ تمام آیات واحادیث معاذ اللہ بے مصرف ہو کے رہ جاتی ہیں اور ان میں جو خلیج پیدا ہوتی ہے اسے کسی تاویل سے پاٹنا ناممکن ہو جاتا ہے آیات یہ ہیں۔

مَاكَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَالْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ط وَمَاكَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِه مَنْ يَّشَآءُ ص فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ج وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (آل عمران:۱۷۹)

منافقو! اللہ ایسا نہیں ہے کہ جس حال میں تم ہو اچھے برے کی تمیز کئے بدوں اسی حال پر مومنوں کو تمہارے ساتھ ملا جلا رہنے دے اور اللہ ایسا بھی نہیں کہ تم کو غیب کی باتیں بتا دے ہاں! اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے انتخاب فرما لیتا ہے (اور ان کو بقدر مناسب بتا دیتا ہے) تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاؤ (اور غیب کی ٹوہ کے پیچھے نہ پڑو) اور اگر ایمان لاؤ گے اور نفاق سے بچتے رہو گے تو تم کو بڑا اجر ملے گا''

اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ط اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ ط بَصِيْرٌO (الحج:۷۵)

''اللہ فرشتوں میں سے بعض کو احکام پہنچانے کیلئے انتخاب فرما لیتا ہے اور اس طرح بعض کو آدمیوں سے بھی کیونکہ اللہ سب کی سنتا اور دیکھتا ہے۔''

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ج وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ

رَفِيْقاً ○ (النسآء: ٦٩)

"جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کہا مانے تو ایسے ہی لوگ (جنت میں) ان (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے (بڑے بڑے) احسانات کئے یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور دوسرے نیک بندے اور یہ لوگ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔"

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ○

(الاعراف: ٣٥)

"اے بنی آدم! جب کبھی تم ہی میں سے ہمارے پیغمبر تمہارے پاس پہنچیں اور ہمارے احکام تم کو پڑھ پڑھ کر سنائیں تو ان کا کہا مان لینا کیونکہ وہ جو شخص ان کے کہنے کے مطابق پرہیزگاری اختیار کرے گا اور اپنی حالت کی اصلاح کرے گا تو قیامت کے دن ان پر نہ تو کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ آزردہ خاطر ہوں گے۔"

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (مومنون: ٥١)

"ہم اپنے پیغمبروں سے بھی ارشاد کرتے رہے ہیں کہ اے گروہِ پیغمبراں ستھری چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ تم جیسے عمل کرتے ہو ہم ان سب سے واقف ہیں۔"

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ۭ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ۭ

(المؤمن:٣٤)

''اور پہلے یوسف علیہ السلام کھلے کھلے احکام لے کر تمہارے پاس پہنچ چکے ہیں تو جو احکام وہ تمہارے پاس لے کر آئے تھے تم اس میں شک ہی کرتے رہے یہاں تک کہ جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم ان کے مرے پیچھے کہنے لگے کہ اس کا جھگڑا تو خدا نے چکا دیا اور اب اس کے بعد کبھی اللہ کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔''

وَاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَلَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا (الجن:٧)

''اور جس طرح تم جنات کو خیال تھا بنی آدم کو بھی خیال ہوا کہ خدا کبھی کسی کو پیغمبر بنا کر نہیں بھیجے گا۔''

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ○ (بنیٓ اسرائیل:١٥)

''اور جب تک ہم رسول بھیج کر اتمامِ حجت نہ کر لیں۔ کسی کو اس کے گناہ کی سزا نہیں دیا کرتے۔''

یہ ہیں وہ تمام آیات جن سے مرزائی دوست ادعائے نبوت پر استدلال کرنا چاہتے ہیں، ان پر مجموعی نظر ڈالنے سے بھی اس طرح کے حقائق سامنے نظر نہیں آتے کہ نبوت کے مضمرات ابھی باقی ہیں یا یہ کہ رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی جاری ہے۔ مدعا و مطلوب کی وحدت اور ارتقاء یا تعین و وضاحت جو اثبات و دعوے کے لئے ضروری ہے ان میں بالکل نہیں پائی جاتی بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مطالب آیات ہیں جن میں کوئی قدرِ مشترک نہیں ہر جگہ ایک نئی حقیقت اور نیا مسئلہ ہے جسے بیان کرنا مقصود ہے۔

پہلی آیت کو مثلاً لیجئے اس میں مدینہ کے منافقین کا تذکرہ ہے کہ تم یہ نہ سمجھو کہ تمہارا یہ خلا ملا مسلمانوں کو ہمیشہ دھوکا دے سکے گا، اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ پاکباز

گروہ اور خبث باطن رکھنے والے آخرکار جدا جدا نظر آئیں، چنانچہ خود تمہارے اعمال، جیسے جہاد سے تخلف، یا جذبہ جہاد سے محرومی وغیرہ ایسی باتیں ہیں کہ جو تمہیں عام مسلمانوں سے ممیز کر کے رہیں گی، باقی رہا یہ کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ تم میں سے ایک آدمی کا نام لے کر کیوں نہیں بتاتا کہ فلاں فلاں منافق ہے تو اس لئے کہ یہ جاننا صرف انبیاء علیہم السلام کا کام ہے تمہارا نہیں۔ تمہارے لئے تو یہی زیبا ہے کہ بغیر غیب کی ٹٹول کے اللہ کے نبیوں پر ایمان لاؤ اور نفاق سے احتراز کرو اور یہ فرمایا کہ ''اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے انتخاب فرمالیتا ہے، تو یہ کوئی اصول نہیں بلکہ سابقہ عادت کی حکایت ہے اس طرح یہ بتانا یہ مقصود ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ماننا نہیں، بلکہ متضمن ہے۔ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے کو۔

دوسری آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو اللہ کے ساتھ دوسرں کو شریک گردانتے ہیں، چنانچہ اس لئے قبل کے آیتوں میں ان کے ٹھہرائے ہوئے معبودوں کی بے چارگی کو بڑی اچھی طرح واضح کیا ہے، فرمایا ''جن کی تم پرستش کرتے ہو، وہ اتنے عاجز ہیں کہ ایک مکھی بھی تو نہیں بنا سکتے۔ یہی نہیں بلکہ اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو یہ سب مل کر بھی اس کو چھڑا نہیں سکتے۔'' اس کے بعد یہ فرمایا کہ اللہ فرشتوں اور انسانوں کو خلعتِ رسالت سے نوازتا ہے۔ لہذا یہ دونوں اس کے ایلچی تو ہو سکتے ہیں خدا نہیں۔

سورہ نساء کی چوتھی آیت میں ذکر ہی قیامت کی رفاقت کا ہے اسی لئے وَحَسُنَ اُولٰئِكَ رَفِيْقًا فرمایا'' اس میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ لوگ کسب واطاعت سے نبی ہو جائیں گے۔ شبہ غالباً حرف عطف سے پیدا ہوا ہے حالانکہ اس میں

صرف اتنا اشتراک کفایت کرتا ہے جو سب کو فی الجملہ شامل ہو اور وہ ہے رفاقتِ اخروی، یہ ضروری نہیں کہ ہر ہر بات میں یہ معطوفات بہم برابر کے شریک بھی ہوں، پس رفاقتِ اخروی سے یہ کب لازم آتا ہے کہ نبوت بھی آنحضرت ﷺ کے بعد حاصل ہو سکتی ہے۔

ہم اس پر بحث کر چکے ہیں، کہ نبوت اطاعت کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت نتیجہ ہوتی ہے، ان کی نبوت کا، یعنی نبوت اللہ تعالیٰ کا ایک انعام تو ہے لیکن یہ انعام پیغام اور دعوت کی ایسی صلاحیتوں کو پیدا کرنے کے بعد ملتا ہے جن کا وجود خود اللہ تعالیٰ کے انتخاب پر موقوف ہے۔

چوتھی آیت سے استدلال صرف اس صورت میں ممکن ہے۔ جبکہ کھلی تحریف کا ارتکاب کیا جائے، یا بنی آدم کا لفظ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی اولین اولاد ہے، قرآن کھول کر اسی سورہ میں قبل کی آیات پر نظر ڈالو، برابر تین جگہ یہی لفظ آیا ہے، اور تینوں جگہ بنی آدم علیہ السلام کو مخاطب کر کے ابتدائی تعلیمات سے آگاہ فرمایا ہے پہلی جگہ لباس پہننے کی ہدایت فرمائی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ط

(الاعراف:۲۶)

''اے بنی آدم'' ہم نے تمہاری ضرورت کیلئے لباس اتارا کہ تم اس سے اپنے جسم کو ڈھانپ سکو''

دوسری جگہ شیطان کے دعاؤں سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے جس نے تمہاری لڑائی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ

(الاعراف:۲۷)

''اے بنی آدم! دیکھو شیطان تمہیں اس طرح آزمائش میں نہ ڈالے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکال باہر کیا۔''

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ (الاعراف: ۳۱)

(اے بنی آدم! نماز کے وقت کپڑے پہن لیا کرو۔''

اور اس آیت میں انہیں یہ بتایا کہ میرے بعد انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام آتے رہیں گے ان کو ضرور ماننا، چنانچہ وہ آتے رہے یہاں تک کہ اس کی مصلحت نے اس کے دروازے بند کر دیئے۔

یہی حال پانچویں آیت کا ہے کہ بلا شدید تصرف کے اجرائے نبوت پر استدلال سخت دشوار ہے، بتانا یہ مقصود ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جب بھی آئے ہیں انہوں نے اکلِ حلال اور عملِ صالح کی طرف ہی بلایا ہے۔

چھٹی اور ساتویں آیت سے استدلال تو بالکل ہی مضحکہ خیز ہو گیا ہے، قرآن حکیم یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قوم نے نہ صرف یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام بلکہ جب ان کا انتقال ہوا تو خوش ہو کر کہا کہ چلو چھٹی ہوئی اب تو کوئی رسول نہیں آئے گا جو ہمیں ہمارے گناہوں پر ٹوکے اور ہماری خواہشات کے خلاف رشد و ہدایت کی راہوں پر ڈالے یعنی ان کی خواہش از راہ کفر و انکار یہ تھی کہ اللہ کا کوئی رسول آئندہ نہ آنے پائے اور ہماری از راہ ایمان یہ ہے کہ نبوت کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور اس لئے اب کوئی جعلساز ہماری سمع خراشی نہ کرے داعیاتِ کفر و انکار اور داعیاتِ ختم و تکمیل میں بڑا فرق ہے۔ یہی حال جنوں کا تھا کہ ان میں بھی کفر و انکار کی وجہ سے مایوسی کا عالم طاری تھا کسی نصِ

دینی کی بناء پرنہیں، اس لئے فرمایا کہ میں اس مایوسی کوختم کرنے کیلئے آ گیا ہوں۔

آٹھویں آیت سے اجرائے نبوت پر یوں استدلال فرمایا گیا ہے چونکہ خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ اتمامِ حجت سے پہلے عذاب نہیں بھیجتا اس لئے اب جبکہ طرح طرح کے عذاب آ رہے ہیں ہمیں اتمامِ حجت کی قطعی ضرورت ہے اور وہ اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ ایک نبی نہ آ جائے لہٰذا نبوت جدیدہ کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ اس گونا گوں عذابوں کی کوئی توجیہہ بیان کی جا سکے۔ حالانکہ اس آیت میں اس کے آنے کا کہیں ذکرنہیں جوفرمایا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اللہ کا عذاب اتمامِ حجت کے بعد آتا ہے اور کون کہتا ہے کہ وہ موجودنہیں۔کیا اسلام اللہ کی سب سے بڑی حجت نہیں؟ کیا ساری تکلیفیں اور یہ سارے عذاب بنی آدم پر اس لئے نہیں آ رہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کوجھٹلا رہے ہیں!



فیصلہ کن تنقیح

- ظلی نبوت کا تصور کیونکر پیدا ہوا
- بائبل میں نبوت کا تصور
- زندگی متحرک ہے
- صحیفۂ آدمؑ کا حجم
- زندگی متحرک تو ہے لیکن
- ایک تمثیل
- دنیا کا پہلا آفاقی مذہب
- اسلام سے پہلے
- عیسائیت کیونکر پیدا ہوئی؟
- مسائل کا فیصلہ کن انداز
- تکمیل کے معنی
- دوسرا محاذ
- کوئی انسان معصوم نہیں
- مذہب کا مطالبہ
- عصمت آئمہ کا عقیدہ کیونکر
- شیعیت، اسلام کے خلاف سازش
- فرقِ مراتب
- ختم نبوت ایک مثبت عقیدہ

فیصلہ کن تنقیح

کیا نبوت صرف اعزاز ہے؟ یہاں تک تو بحث کا رنگ منقولی تھا اب یہ دیکھنا ہے کہ عقلی چھان بین ہمیں کن نتائج تک پہنچاتی ہے۔ اس سلسلہ کی فیصلہ کن تنقیح یہ ہے کہ نبوت کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی کیا یہ صرف ایک طرح کا اعزاز یا شرف اور فضل ہے جس سے اللہ نے اپنے بندوں کو مختلف زمانوں میں نوازا ہے یا اس کے سامنے کوئی اصلاحی غرض بھی ہے۔ پھر اس پر غور کرنا ہے کہ کیا یہ اصلاحی غرض ایسے ڈھنگ کی ہے کہ کبھی نہ کبھی تکمیل پذیر ہو سکے یا اس کا مزاج ہی اس انداز کا ہے کہ ہمیشہ تشنہ اور نامکمل رہے۔ اجرائے نبوت کے تصور میں ساری خرابی اسی ایک تنقیح کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ اگر صورتِ مسئلہ یہی ہے کہ نبوت محض ایک طرح کی بخشش و عطا ہے اور اس کے سامنے زندگی کا ایسا چوکھٹا نہیں ہے جسے مکمل کرنا مقصود ہے یا زندگی چوکھٹا ہی ایسا ہے کہ زمانے کے تغیرات سے وہ روپ بدلتا رہتا ہے تو یہ عقیدہ بلاشبہ صحیح ہوگا کہ نبوت کے کواڑ کھلے ہیں اور اگر اس کے برعکس نبوت سے متعلق تصور یہ ہے کہ اس سے کچھ مقصود ہے اور وہ مقصود ارتقاء کے ایک موڑ پر اپنے تمام مضمرات کے ساتھ اس طرح چشمِ نبوت کے سامنے کھل کر آ جاتا ہے کہ پھر اس کی تکمیل و اتمام میں کوئی زحمت محسوس نہیں ہوتی۔ تب ختمِ نبوت کے اصول کو صحیح ماننا پڑے گا یعنی اگر انسانی معاشرہ کا ڈھنگ یہ ہے کہ یہ کسی منزل پر بھی نپے

تلے اور جامع احکام کا محتاج نہیں ہے اور خود خیر وصواب کی قدریں ہمیشہ تغیر پذیر اور متبدل رہی ہیں تو اجرائے نبوت کے عقیدہ کو ماننے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا لیکن اگر انسانی معاشرہ طفولیت سے گذر کر بلوغ کی تمام ممکن منزلیں طے کر چکا ہے اور مسائل زیر بحث کے تمام پہلو نکھر کر انسان کے سامنے آ گئے ہیں اور تہذیب و ثقافت کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہا کہ جو اس وقت نظروں سے اوجھل ہو تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ ختم نبوت ہی کے مضبوط حصار میں انسانی فکر وعمل کے لئے عافیت مضمر ہے ورنہ یہ خطرہ ہے کہ نفس نبوت ہی پر سے اعتقاد نہ اٹھ جائے کیونکہ آخر میں اجرائے نبوت کے یہی معنی تو ہوتے ہیں کہ اخلاقی و دینی قدریں اضافی اور غیر حقیقی ہیں جن کا زمانہ کے ارتقاء اور تغیر کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا قطعی ضروری ہے۔

یہ واضح رہے کہ ہمارے سامنے وہی اصطلاحی معنی ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں اس کا ظلی اور بروزی ظہور قطعی خارج از بحث ہے کیونکہ اگر بربنائے بخشش وعطا ہی نبوت کا اجراء ضروری ٹھہرتا ہے تو پھر اس بخشش وعطا کو بہرآئینہ مکمل ہی ہونا چاہئے چنانچہ قرآن حکیم میں ایسے انبیاء علیہم السلام کا کوئی تذکرہ نہیں ہے جن کی نبوت منفرد اور مستقل بالذات نہ ہو بلکہ کسی بڑی نبوت کی شاخ یا فرع ہو۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ ہی کو دیکھئے ایک زمانہ میں ایک ہی قوم کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوتے ہیں پھر ان میں عمروں کا تفاوت بھی اچھا خاصا موجود ہے بلکہ نبوت کی عمر میں بھی تفاوت ہے اور نبوت بھی حضرت موسیٰؑ کی سفارش پر ملی ہے تاہم جب نبوت سے سرفراز کرنے کا ذکر آتا ہے تو قرآن دونوں کی شخصیت کو الگ الگ اور جدا جدا قرار دیتا ہے۔

وَ اٰتَیْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ (الصّٰفّٰت ۱۱۷)

''ہم نے ان دونوں کو کھلی اور واضح کتاب عطاء کی''۔

ظلی نبوت کا تصور کیونکر پیدا ہوا

ظلی و بروزی کا یہ غیر قرآنی تصور جس میں ایک نبی تو اصلی اور حقیقی ہو اور دوسرا بالتبع' بالکل ضمنی اور تابع قرار پائے' اصل میں مرزا صاحب کے ذہن میں تصوف کی راہوں سے آیا اور بائبل کے مطالعہ نے اس کی مزید تائید فراہم کی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جن لوگوں نے عہد نامہ قدیم میں انبیاء علیہم السلام کو کارواں در کارواں' ایک ہی زمانہ میں اور ایک ہی قوم میں تبلیغ و اشاعت کے کام میں مصروف دیکھا ہے۔ انہیں حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا یہ محض اس کی بخشش کی ارزانیاں ہیں یا یہ بات ہے کہ ان قوموں سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبت تھی اس ضمن میں یہ نکتہ نہ بھولئے کہ یہیں سے ایک جذباتی سی خواہش دلوں میں یوں ابھری کہ امت محمد ﷺ تو آنحضرت ﷺ کے بعد ایک پیغمبر کو ترس ترس جائے اور ان قوموں پر یہ عنایت ہو کہ انوار و برکات کی ایک بھیڑ موجود ہے جو دلوں کی صفائی اور کیرکٹر کی ستھرائی میں لگی ہے پھر اس کی توجیہہ ذہن میں آئی کہ اصل میں اس پوری جماعت میں حقیقی پیغمبر تو ایک ہی ہوتا تھا باقی ان کے نائب اور تابع ہوتے تھے جنہیں اطاعت و ریاضت کی کثرت کے پیش نظر ضمناً منصب نبوت سے سرفراز ا جاتا۔ لہٰذا امت محمدیہ ﷺ میں بھی یہ گنجائش رہنا چاہئے کہ اس میں بھی بے شمار لوگ اپنی نیکی و پارسائی کی وجہ سے نبی کہلائیں اور امت کی اصلاح پر مامور ہوں' یہ ہے وہ نفسیاتی خاکہ جو مرزا صاحب کے ذہن میں پیدا ہوا اور ظلی نبوت کا محرک بنا۔ حالانکہ اہل علم جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں نبوت کا تصور اس تصور سے کوئی میل نہیں کھاتا جو قرآن کے

سامنے ہے کیونکہ اس میں اتنی لچک ہے کہ علماء پر بھی انبیاء کا اطلاق ہو سکے۔

بائبل میں نبوت کا تصور

بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں جب دینی جذبہ کی درجہ غایت کمی ہوئی اور لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو قریب قریب بھول گئے تو حضرت سموئیل نے احیاءِ دین کی غرض سے ''الرامۃ'' میں عظیم الشان تبلیغی مدرسہ قائم کیا اور ان لوگوں کو جنہوں نے یہاں تعلیم پائی اور اپنے آپ کو تبلیغی خدمات کیلئے وقف کیا۔ ''انبیاء کے بیٹے'' قرار دیا پھر اسی طرح کے مدرسے بھی بیت اہل، ریحا اور جلجال میں قائم ہوئے ان میں طلباء کو تبلیغ و اشاعت کیلئے تیار کیا جاتا یہی لوگ جب ہزاروں کی تعداد میں فارغ ہو کر نکلے تو لوگوں نے انہیں انبیاء ہی کے نام سے موسوم کرنا شروع کر دیا اور پھر یہ اصطلاح اتنی عام ہوگئی کہ یہودیوں کی تباہی کے بعد جب دوبارہ بائبل کو مرتب کیا گیا تو ان کو انبیاء ہی رہنے دیا گیا۔

ہم یوں بھی ظلی نبوت کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے کہ عقلاً ختم نبوت سے جو اصول متصادم ہے وہ مسئلہ ارتقاء کا ہے اور ارتقاء قطعی اس پر قانع نہیں کہ زندگی کے اصولوں اور بنیادوں کو بدلے بغیر برائے نام ایک منصب جاری رہے۔ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر زمانہ میں پوری مذہبی زندگی کا جائزہ لیا جائے اور اس کو وقت کے رجحانات کے مطابق بدلا جائے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ارتقاء سرے سے مذہب کی اس حیثیت ہی کو نہیں مانتا کہ وہ زندگی کے حدود کو متعین کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر اجرائے نبوت کے یہ معنی ہیں کہ ہر دور میں ایک نئی شریعت آنا چاہئے اور ہر زمانے میں ایک نیا دستور وضع ہونا چاہئے تب تو اس کے کچھ معنی بھی ہیں۔ اگرچہ غلط ہیں اور اگر عملاً

قیامت تک اسلام ہی کی فرمانروائی کو تسلیم کرنا ہے اور آنحضرت ﷺ ہی کو آخرِ کار سند وحجت ماننا ہے تو پھر اس قیل وقالِ بے ہودہ کا فائدہ؟ مرزا صاحب کو اپنی اس کمزور پوزیشن کا احساس تھا کہ بغیر شریعت کے نبوت کا ڈھونگ کیا معنے؟ اس لئے عام طور پر اگر چہ وہ مصلحتاً زیادہ نہیں پھیلتے تھے اور مسلمانوں کو بظاہر یہی یقین دلاتے تھے کہ میری نبوت آنحضرت ﷺ کی نبوت سے الگ کوئی شے نہیں ہے اور میں محض ان کا ایک خادم ہوں۔ وہ تو کثرتِ اطاعت وخدمت کا تقاضا ہے کہ ازراہِ مجاز وظل مجھے نبوت کے اعزاز سے نوازا گیا ہے ورنہ میں کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا لیکن جب ذرا مزے میں آتے تھے تب اس جھول کو یوں پورا کرتے تھے کہ ''ماسوا اس کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا ہے جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر اور نہی بیان کئے اور اپنی امت کے لئے ایک قانون مقرر کیا وہی صاحب الشریعت ہو گیا۔ پس اس تعریف کی رو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہیں اور نہی بھی'' **(رسالہ اربعین 4 ` صفحہ 6-7)**

جہاں تک تنقیح کی اس شق کا تعلق ہے کہ نبوت صرف ایک طرح کا اعزاز ہے یا اس کے سامنے کوئی نصب العین بھی ہے جواب بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں یہی چاہتی ہیں کہ اس کا کوئی فعل بھی بے معنیٰ اور بے کار نہ ہو۔ قرآن حکیم میں متعدد انبیاء علیہم کا تذکرہ آیا ہے اس میں ان کی ان خدماتِ جلیلہ کا تفصیل سے ذکر ہے جو انہوں نے انجام دیں اس لئے اس پہلو پر بحث بے فائدہ ہے۔

زندگی متحرک ہے

جو چیز غور وفکر کی محتاج اور بحث طلب ہے وہ یہ ہے کہ آیا انسانی معاشرہ ہر لمحہ تغیر

پذیر ہے یا کہیں کسی منزل پر تکمیل واتمام کے تقاضوں کے سامنے اس کی رواں گاڑی رکتی بھی ہے؟ حکمائے مغرب کا ایک گروہ انسانی معاشرہ کو بھی بجائے خود اسی طرح نامی، ہے اور ہر آن ارتقاء پسند سمجھتا ہے جس طرح کائنات کے دوسرے ظہورات، برگسان کا قول ہے کہ انسانی معاشرہ زندگی کے نئے نئے میدانوں میں خیمہ گاڑھتا رہتا ہے اور یہ واقعہ ہے حقیقت اس سے زیادہ ایک حرف نہیں کہ وہ تعبیر ہے، ایک طرح کی حرکت ہے جس کی سمتیں اور منزل پہلے سے متعین ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور بڑے بڑے فلسفی صرف اتنا کرتے ہیں کہ اپنے پیغام وعمل سے اس معاشرہ کی رہنمائی کرتے ہیں اور ان راہوں پر اسے ڈالتے ہیں جو آسانی سے منزل تک پہنچانے میں مددومعاون ہوں۔ نشوونما کی صلاحیتیں پہلے سے معاشرہ میں موجود ہوتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اور حکماء وقائدین کی کوششوں سے صرف یہ ہوتا ہے کہ ان صلاحیتوں میں ایک طرح کی زندگی وتازگی پیدا ہو جاتی ہے اور انسانی معاشرہ اس لائق ہو جاتا ہے کہ اپنے سفر کو خوش اسلوبی سے جاری رکھ سکے اور آگے بڑھا سکے۔

صحیفہء آدمؑ کا حجم

زندگی سے متعلق یہ نظریہء ارتقاء صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ صحیح اس حد تک ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی بلاشبہ بالکل سادہ خانوں سے شروع ہوئی۔ چنانچہ ابوالبشر حضرت آدمؑ کو جو پہلے انسان اور پہلے پیغمبر ہیں جو کتاب ہدیٰ دی گئی۔ اس کا حجم دو سطروں سے زائد پھیلاؤ کا نہیں ایک سطر میں اللہ کی توحید کے ساتھ ساتھ ان کے گردوپیش کا تعارف مرقوم ہے۔

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرۃ:۳۱) ''اور آدمؑ کو سب چیزوں کے نام

بتائے'' اور دوسری سطر میں لکھا ہے۔

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (البقرة:۳۵) ''اور دیکھو اس درخت کے قریب نہ جانا''۔ پھر جس رفتار سے زندگی کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا' احکام بھی اسی نسبت سے پھیلتے گئے' قرآن حکیم کے مطالعہ سے ہمیں انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں برابر ایک طرح کی تدریج و ارتقاء کا سراغ ملتا ہے اور محسوس طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہر لاحق نے اپنے سابق سے معاشرہ کی دولت کو جس حال میں پایا ہے اس میں کچھ اضافہ ہی کیا ہے یا یوں کہئے کہ معاشرہ کی رفتار کو صحیح سمتوں پر ڈالنے کے علاوہ آگے بھی بڑھایا ہے۔

قرآن حکیم چونکہ ایک اصولی کتاب ہے اس لئے اس میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کا حال ضمناً ہی آیا ہے اگر حقیقت کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ کرنا ہو کہ شریعت و احکام کا آغاز کیونکر سادگی سے ہوا اور پھر کس طرح اس کا معاملہ آہستہ آہستہ پیچیدہ ہوتا گیا اور پھیلتا گیا تو اس کے لئے بائیبل کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہاں آپ کو معاشرہ واقعی ایک رفتار سے چلتا ہوا اور ایک خاص رخ کی طرف بڑھتا ہوا معلوم ہوگا۔ یعنی یہاں آپ اس کی چال اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے اور معلوم کر سکیں گے کہ شریعت و آئین میں کیونکر اور کب ناگزیر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

اثریات کے مطالعہ نے بھی ہمارے سامنے قوموں کے ابتدائی کلچر کو بڑی حد تک اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں انسان کی ترقی کی کون کون منزلیں طے کیں اور اس کی زندگی کے ڈھنگ میں کیا کیا تغیرات رونما ہوئے۔ یہ صحیح ہے کہ ارتقاء کی یہ گاڑی کبھی بخط مستقیم آگے نہیں بڑھی بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ فکر و عمل کی ایک ہی لغزش نے انہیں صدیوں پیچھے پھینک دیا۔ پھر اس کی راہ

میں موڑ انحراف اور بے شمار رکاوٹیں بھی آئی ہیں لیکن جہاں تک رشد و ہدایت کا تعلق ہے اس کے تقاضوں نے کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ﷺ آتے رہے۔ اس لئے بحیثیت مجموعی یہ کہنا درست ہے کہ معاشرہ برابر حرکت پذیر رہا اور آئین و شریعت کے اعتبار سے زندگی کے چوکھٹے بدلتے رہے۔

زندگی متحرک تو ہے لیکن اس کی ایک منزل بھی ہے

غلط اس نقطہ نگاہ سے ہے کہ یہ رفتار قیامت تک اس نہج سے جاری رہے گی اور عقائد و عمل کی دنیا میں سچائیوں اور صداقتوں کا وزن متغیر ہوتا رہے گا۔ اس خیال کی تہہ میں ایک طرح کا ذہنی مغالطہ نہاں ہے، ذہن کی عادت یہ ہے کہ یہ جب ایک چیز کو ایک سے زائد بار ایک ہی ڈھنگ پر ظاہر ہوتے دیکھتا ہے تو اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ یہ اسی طرح ہمیشہ ظاہر ہوتی رہے اور پھر اس سے آگے بڑھا کر آخر کار یہ حکم لگا دیتا ہے کہ یہ اسی طرح ہوگا۔ مادہ کی تقسیم پذیری کے مسئلہ میں یونانیوں کو یہی دھوکا ہوا یعنی جب ذہن نے دیکھا کہ ہر چیز تقسیم ہونے اور مختلف اجزاء میں بٹ جانے کے بعد بھی مزید تقسیم کی متحمل رہتی ہے تو اس سے اندازہ ہوا کہ تقسیم و تجزیہ کا یہ فعل کبھی ختم نہ ہوگا اور مادہ کا ہر ہر جز برابر تقسیم ہوتا چلا جائے گا۔ حالانکہ یہ بداہتۃً غلط ہے۔ ایک کشتی چلتی ہے ایک جہاز سمندر میں تیرتا ہے ایک تیر فضا میں چھوڑا جاتا ہے۔ ذہن کا یہ قیاس صحیح ہو تو پھر کشتی کو کبھی ساحل تک نہیں پہنچنا چاہئے۔ جہاز کو کہیں بھی لنگر انداز نہیں ہونا چاہئے اور تیر کو کبھی ہدف تک نہیں پہنچا چاہئے۔ اجرائے نبوت کے باب میں بھی ذہن نے یونہی سوچا۔ یاد رہے کہ نبوت و رسالت اللہ تعالیٰ کا ایک فیض ایسا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی رہنمائی کی

جائے اور اسے ایسی راہوں پر ڈالا جائے جو اسے منزل تک پہنچا دیں۔ قوموں کی زندگی میں ایسا مقام ہزاروں اور لاکھوں سالوں کے بعد بہر آئینہ ضرور آتا ہے جب یہ راہیں منزل تک جاتی ہوئی صاف دکھائی دیتی ہیں۔ مزید براں انسانی زندگی کے مسائل ایسے ہیں جو تغیر وارتقاء کی مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے آخر کار اس مرحلہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں اختلاف وتنوع کی رنگارنگی ختم ہو جاتی ہے اور مسئلہ کے تمام پہلو یا مضمرات نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔

ایک تمثیل

انسانی زندگی کی مثال ایک درخت کی طرح ہے جو پہلی منزل میں صرف ایک بیج ہے، ایک دانہ ہے، جسے دیکھ کر اس کے اندر کے مضمرات کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ پھر جب اس کو زمین میں ڈالا جاتا ہے تو اس میں نشو ونما کی صلاحیتیں بیدار ہونا شروع ہوتی ہیں۔ ابتداء میں صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک سوئی سی زمین کا سینہ چیر کر نکلتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ننھی ننھی کونپلوں کا اضافہ ہوتا ہے ' پھر پتیاں بنتی ہیں، رنگ وروپ نکھرتا ہے اور قد بڑھتا ہے تا آنکہ ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ بیج کے تمام مضمرات پوری طرح ظاہر ہو جاتے ہیں اور آپ پکار اٹھتے ہیں کہ اب یہ پورا پورا پیڑ ہے' یہ آم ہے' یہ کھجور ہے' بلاشبہ اس کے بعد بھی اس میں تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ تغیرات بالکل جزوی ہوتے ہیں ان سے درخت کی اصلی فطرت متاثر نہیں ہوتی۔ یعنی آم وہی آم ہی رہتا ہے اور کھجور کے مزاج وخصوصیات میں بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔

ٹھیک اسی طرح ہماری اجتماعی زندگی کا معاملہ ہے کہ حضرت آدمؑ سے اس کا

آغاز ہوا پھر ہر دور میں اس کے خدوخال ایک خاص نقشے اور روپ میں ڈھلتے چلے گئے اور پھر ایک ایسی منزل آ گئی جب دیکھنے والوں نے کہا کہ اب تہذیب و ثقافت اور اخلاق وسیاست نے تغیر وترقی کا طویل سفر طے کرنے کے بعد وہ جگہ پالی ہے جہاں فی الحقیقت پہنچنا مقصود تھا یہاں پہنچ کر یہ گاڑی یقیناً رکنا چاہئے کیونکہ اس سے آگے کوئی نیا اور بڑا اسٹیشن ہی نہیں۔ جن جن اجتماعی الجھنوں سے ہمیں دوچار ہونا تھا ان سے دوچار ہو چکے اور جو نئی الجھنیں پیش آ سکتی ہیں ان کا اندازہ ہے اس لئے اب کسی نبوت کا انتظار نہیں جو صورتحال میں ایسا تغیر پیدا کر دے جو خلاف توقع ہو، ہدایت وصداقت کے تقاضے مکمل ہو چکے اور گمراہیاں بھی انتہاء کو پہنچ چکیں۔ یعنی وہ تمام فتنے جو ابھر سکتے تھے ابھر چکے اور تمام برائیاں رائج ہو چکیں۔ اس پر بھی اسلام کی جامعیت واکملیت کا یہ حال ہے کہ کہیں اس نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا اور کسی مقام پر بھی اس کی شان ختمیت میں فرق نہیں آیا۔

دنیا کا پہلا آفاقی مذہب

اسلام کے مرتبہ ختمیت واکملیت کا اندازہ خصوصیت سے دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ ایک تاریخ کے اس موڑ سے جس میں یہ جلوہ طرازِ عالم وعلمیاں ہوا اور دوسرے مسائل کی اس فیصلہ کن نوعیت اور ڈھنگ سے جو صرف اسی کا حصہ ہے اس کے پیغام کی ایک جانی بوجھی خصوصیت آفاقیت ہے۔ یہ دنیا کا پہلا اور آخری مذہب ہے جس نے گروہ اور شعب کے حدود سے آگے بڑھ کر نفس انسانیت کو اپنا مخاطب ٹھہرایا جس نے تمام جغرافیائی حد بندیوں کا انکار کیا۔ نسلی وقبائلی حصاروں کو توڑا اور رنگ و بو کے اختلافات سے قطع نظر کر کے پورے انسانی معاشرہ کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا۔

یعنی اسلام دنیا کا پہلا عملی مذہب ہے جس میں مقام و زبان کی جکڑ بندیوں کو ختم کیا گیا اور جو ایسی دینی قدروں پر اپنے عقیدہ کی بنیاد رکھتا ہے جو غیر مقامی اور ابدی ہیں۔ اس آفاقیت کیلئے عیسائیت کی بدولت راہیں ہموار ہو چکی تھیں، پولوس کی تبلیغی کوششوں سے رومیوں میں ایک بڑی تعداد غیر مختونوں یا انجیلوں کی اصطلاح میں غیر قوموں کی تیار ہو گئی تھی جن کے دلوں میں عیسائیت کے لئے خاصی تڑپ تھی اور قسطنطینِ اعظم کے عیسائی ہو جانے سے تو گویا عیسائیت کی حیثیت سرکاری مذہب ہی کی ہو گئی تھی اس لئے یورپ میں اسے پاؤں پسارنے کا خوب موقع ملا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کی برکت سے ان مغربی قوموں کی فطری حوصلہ مندی بروئے کار آئی اور یہ یوں فاتحانہ طور پر یورپ و ایشیا کی مختلف قوموں کو جو صدیوں سے جدا جدا رہتی تھیں ملا دینے میں کامیاب ہوئی اور اس طرح یہ تو ہوا کہ انسانیت چھوٹے چھوٹے قومیت کے دائروں سے نکل کر ایک بڑے دائرے میں داخل ہوئی اور آفاقیت و عالمگیریت کی طرف ابتدائی قدم اٹھا۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ عیسائت کے پاس ایسی کوئی عالمی دعوت نہیں تھی جس پر پوری انسانیت کی شیرازہ بندی ہو سکتی۔ عمل کا کوئی چوکھٹا نہیں تھا جو مختلف قوموں اور ملکوں کی رنگا رنگی کے باوجود بکار آمد ہوتا اور رنگ و نسل کے اختلاف کے علی الرغم انسانیت کیلئے ایسی اونچی اخلاقی و معاشرتی سطحیں مہیا کرتا جہاں سب فرقے مٹ جاتے اور اخوت و بھائی چارہ کی بنیاد پڑتی۔ لہذا اس کی فتوحات عملاً صرف اتنا ہی کر سکیں کہ انسانی معاشرہ کو تاریخ کے ایسے موڑ پر لا کر چھوڑ دے، جہاں اجتماعیت بیدار ہو اور آفاقیت کروٹ لے، اب یہ کام اسلام کا تھا کہ اس میں افادیت و تکمیل کا رنگ بھر دے۔

اسلام سے پہلے

تاریخ کی اس مناسبت پر جس سے اسلام آخری مذہب قرار پاتا ہے ایک اور اعتبار سے بھی غور ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ اس سے قبل کے مذاہب پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر دیکھیں کہ انہوں نے رشد وہدایت کے تقاضوں کو کس حد تک تشنہ چھوڑا۔ مثلاً یہودیت کو لیجئے جن لوگوں نے اس کے مطالعہ میں تھوڑی سی بھی زحمت گوارا کی ہے وہ جانتے ہیں کہ صدیوں کے تغیر وتبدل کے بعد اس میں جو ہولناک عیب پیدا ہوگیا تھا وہ مذہب کے باب میں ان کی وہ تنگ نظری تھی جس کی وجہ سے زندگی کا پھیلاؤ سمٹ کر چند مسائل میں محدود ہوکر رہ گیا تھا اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ یہودی ان مسائل کے معاملہ میں بھی مخلص نہیں تھے۔ صرف الفاظ اور ظواہر کی حد تک پابندی کے قائل تھے۔ مذہب سے ان کی دلچسپی صرف اتنی ہی تھی کہ اس میں چند مسائل ہیں، چند احکام اور رسوم ہیں جن کی ٹھیک ٹھیک تعیین اور وضاحت ہونا چاہئے۔ عمل ضروری نہیں چنانچہ قرآن حکیم نے ان کی اسی کمزوری کی طرف اس مشہور واقعہ میں اشارہ کیا ہے کہ جب انہیں ایک قتل کے سلسلہ میں گائے ذبح کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے اس پر بڑی جرح کی۔ قانون اور ضابطے کی رعائت سے مین میخ نکالی اور بظاہر ذبح کرنے پر مجبور بھی ہوگئے۔ لیکن دلوں کی حالت یہ تھی کہ وہ اس کے لئے قطعی آمادہ نہیں تھے۔

فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ○ (البقرۃ:۷۱)

"اس پر انہوں نے گائے ذبح تو کرڈالی لیکن وہ ایسا کرنے کے نہیں تھے"۔

دین کے اس جزوی تصور اور کھوکھلے لفظی لگاؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دوسرے خیال

کیلئے فضاء ہموار ہوگئی۔

عیسائیت کیونکر پیدا ہوئی

اور وہ یہ تھا کہ شریعت کی پابندی ہی انسان کے لئے غیر فطری ہے یہی وجہ ہے کہ انسان اس سے جی چراتا اور پہلو تہی کرتا ہے۔اس لئے دین کا تصور ہی ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں سونا گزیرا اخلاقی پابندیوں کے اور کوئی شرعی و دینی پابندی نہ ہو، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ عیسائیت آگے بڑھتی ہے اور پولوس اس اصول کو بنیادی عقیدے کے طور پر پیش کرتا ہے۔یعنی صاف صاف کہتا ہے کہ شریعت معاذ اللہ لعنت ہے اور مدارِ نجات عمل نہیں بلکہ عقیدہ اور ایمان ہے۔اس سے اتنا فائدہ تو ہوا کہ یہود کی فقیہانہ بدکاری ختم ہوگئی لیکن ایمان وعقیدہ کی روک اتنی مضبوط ثابت نہ ہوئی جو فسق و فجور کی بوقلمونیوں پر قابو پا سکے لہٰذا تاریخی طور پر ضرورت محسوس ہوئی کہ اب مذہب کا جامع اور آخری تصورِ رہنمائی کیلئے آگے بڑھے جو شریعت و ایمان کے حدود کو متعین کر سکے۔جو عقیدہ و عمل میں ٹھیک گرہ لگا سکے اور یہ بتا سکے کہ ایمان زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں اور زندگی کا تصور اس ڈھنگ سے پیش کر سکے کہ گویا وہ اس درجہ فطری اور ضروری ہے کہ اس سے اغماض نفسِ زندگی کے اغماض کے مترادف ہے۔ عیسائیت و یہودیت کے اس بگڑے ہوئے تصور نے مذہب کو جس روپ میں پیش کیا اس کا قطعی طور پر تقاضا تھا کہ انسان کو اب زیادہ پریشان نہ کیا جائے اور اسلام اپنی آخری ومتوازن تعلیمات کے ساتھ رہنمائی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے۔

مسائل کا فیصلہ کن انداز

مسائل کے باب میں بھی اسلام نے جو فیصلہ کن انداز اختیار کیا ہے اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہی دین خدا کا آخری اور مکمل دین ہے اور یہ حقیقت اتنی واضح اور نمایاں ہے کہ جن لوگوں نے بحث کے اس پہلو پر غور کیا ہے وہ اکثر مناظرانہ قیل و قال سے بے نیاز ہو گئے ہیں یعنی اگر قرآن حکیم میں ختم نبوت سے متعلق کوئی تصریح مذکور نہ ہو تکمیلِ دین کا کوئی مژدہ اس میں نہ ہوتو تب بھی یہ دین اپنی جگہ اتنا مکمل اور جامع ہے کہ پہلی نظر سے اس کی جامعیت و اکملیت کا یقین ہو جاتا ہے۔ آپ ہی بتائیے عقائد میں توحید سے آگے انسانی تصور کے لئے پرواز کی کوئی گنجائش ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جس ڈھب سے اپنی صفات پیش کی ہیں ان سے زیادہ بہتر انداز انسانی سمجھ بوجھ اختیار کر سکتی ہے؟ عبادات میں نماز سے زیادہ کامل، زیادہ جامع اور زیادہ روحانیت آفریں نقشہ ہمارے ذہن میں آتا ہے؟ معاشرتی زندگی میں مرد اور عورت کے حقوق کی تعین جس توازن سے اسلام نے فرمائی ہے اس میں کسی اصلاح و ترمیم کے لئے کوئی جگہ چھوڑی ہے؟ سرمایہ اور محنت کے مسئلہ کو جس خوبی سے حل فرمایا ہے انسانیت کے بڑے سے بڑے حامیوں کو بھی اس سے بہتر حل سوجھا ہے؟ یعنی زندگی کے پورے چوکھٹے کو اسلام نے جس طرح سجایا ہے اس کی زیب زینت پکار پکار کر اس کی تکمیل و اتمام پر گواہی دے رہی ہے۔

تکمیل کے معنی

اس فصل کے اختتام سے پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ تکمیلِ دین سے اسلام کا منشاء کیا ہے۔ اس کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اسلام معاشرۂ انسانی کے تسلسل و ارتقاء کے بارے میں مایوس ہے۔ یعنی اس کا خیال ہے کہ آئندہ اس میں کوئی تغیر رونما ہونے کا نہیں حالانکہ سائنس کی ترقیات صبح و شام اس تصور کی تردید کر رہی

ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تغیرات تو ہوتے رہیں گے۔ معاشرہ انسانی آگے بھی بڑھے گا مگر اس میں بنیادی تبدیلیاں رونما نہ ہوں گی۔ سائنس کی ترقیات سے صرف اتنا ہو جائے گا کہ جزئیات کی نئی نئی شکلیں ہمارے سامنے آئیں۔ اقتصاد و سیاست کی نئی نئی جزوی الجھنیں پیدا ہوں جو ہمارے معاشرتی چوکھٹے کو فی الجملہ متاثر کریں۔ ایسا یقیناً ہوتا رہے گا اور ایسا ہونا قطعی اسلام کے حق میں مضر نہیں۔ اسلام کی پوزیشن یہ ہے کہ یہ مکمل ہونے کے باوجود اپنے اندر اجتہادی لچک بھی رکھتا ہے اس لئے اس طرح کی صورتحال سے عہدہ برا ہونا کچھ بھی دشوار نہیں۔

دوسرا محاذ

ختم نبوت کے متعلق ایک محاذ تو ان لوگوں کا تھا جو کھلے بندوں آنحضرت ﷺ کے بعد اجرائے نبوت کے قائل تھے ان سے متعلق ہمیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے۔ ایک دوسرا محاذ ہے جن سے نمٹنا آسان نہیں کیونکہ یہ لوگ بظاہر ختم نبوت کے قائل ہیں لیکن عقیدہ و عمل کے اعتبار سے ان میں اور دوسرے گروہ میں ہمیں غور وفکر کے بعد بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اس اجمال کی تفصیل معلوم کرنا ہو تو حضرات تشیع کا جو عقیدہ آئمہ اطہار سے متعلق ہے اس پر غور فرمائیے۔ اس سلسلہ کی پہلی بات جس سے نبوت و امامت کے ڈانڈے ملے ہوئے محسوس ہوئے ہیں یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اس بات کا مقتضی ہے کہ انسانی ہدایت کیلئے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بھیجے اسی ڈھنگ کا ایک سلسلہ امامت کا ہے جسے حفظِ دین کی خاطر مقرر کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کا جاری رکھنا بھی اس کے لطف و کرم کیلئے اتنا ہی ضروری ہے۔ پھر جس طرح پیغمبر معصوم ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی واجبات سے ہے کہ امام بھی

معصوم ہو۔ علامہ حلی نے اس پر پانچ دلائل پیش کئے ہیں:۔

(1) امامت کی ضرورت یوں محسوس ہوتی ہے کہ عوام ہمیشہ لغزش و خطاء کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔لہذا ایک شخصیت ایسی ہونا چاہئے جو نگران ہو،اب اگر یہ شخصیت بھی غلطی کرسکتی ہے تو اس کی ضرورت ہی نہ رہی۔

(2) امام محافظِ شرح ہے اس لئے اس کے حق میں عصمت کا ہونا شرائط اولیہ سے ہے۔

(3) اگر امام سے غلطی کا امکان ہو تو اس غلطی پر اسے ٹوکنا اور متنبہ کرنا جائز ہوگا حالانکہ اس کی اطاعت ضروری ہے۔

(4) اگر اس سے غلطی کا صدور ہو تو وہ غرض ہی فوت ہو جاتی ہے جس کے لئے اس کے نصب کو ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔

(5) اس غلطی کے ارتکاب کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کا مرتبہ عوام سے بھی کم درجہ کا ہے کیونکہ اس کی عقلی صلاحیتیں عوام سے بہرآئینہ زیادہ ہوتی ہیں۔تعلق باللہ اور معرفتِ الٰہی کے نقطہ نظر سے بھی اس کا مقام اونچا ہے۔

اس پر بھی اگر یہ غلطی کرسکتا ہے تو عوام اس سے اچھے رہے کہ کم صلاحیتوں کے باوجود غلطیوں سے بچے رہنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

اس سے قطع نظر کہ ان دلائل کی منطقی حیثیت کیا ہے اور کیونکر علامہ حلی نے ایک سنجیدہ دینی عقیدے کی بنیاد خطابیات پر رکھی ہے سرِ دست اس پر غور فرمائیے کہ امام کا حضرات امامیہ کے نزدیک معصوم ہونا ضروری ہے۔حقیقت غور طلب یہ ہے کہ معصوم امام مفترض الطاعۃ بھی ہوتا ہے۔اب اگر تین باتوں کو باہم ملائیے گا تو نتیجہ میں جو شے سامنے آئے گی وہ یہ ہے کہ نبوت کے ساتھ ساتھ حضرات شیعہ کے نزدیک ایک بالکل متوازی نظام امامت کا بھی جاری ہے یعنی جس طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ

والسلام کی بعثت ضروری ہے اسی طرح آئمہ کا نصب ضروری ہے۔ جس طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام فکر وعمل کے اعتبار سے معصوم ہوتے ہیں اسی طرح آئمہ اطہار کا دامن ہر طرح کی ذہنی وعملی لغزش سے پاک ہوتا ہے۔ پھر جس طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ماننا ان پر ایمان لانا اور ان کے فیصلوں کے سامنے اطاعت کے لئے گردن جھکانا فرض ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ حضرات آئمہ کی اطاعت کی جائے اور ان کے فیصلوں کے سامنے سر جھکایا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ نبوت اور امامت میں بعض صفات کی کمی بیشی مابہ الامتیاز ہو مگر جہاں تک نبوت کے اس تصور کا تعلق ہے جو ہر آدمی کی سمجھ میں آسکتا ہے اس کے یہ تین ہی بڑے بڑے اجزاء ہو سکتے ہیں۔ بعثت ونصب کا وجوب عصمت کا ہونا اور اطاعت وانقیاد کی فرضیت، یعنی اللہ نے اسے بھیجا ہو، عملی زندگی پاک اور نمونے کی ہو اور اس کی اطاعت انسان پر فرض ہو اور ان تینوں باتوں میں امامت ونبوت میں اشتراک ہے۔ اب اگر ایک گروہ یہ مانتا ہے کہ ختم نبوت سے صرف اتنا ہی ہو پایا ہے کہ لفظِ نبوت کا اطلاق کسی دوسرے شخص پر نہیں ہو سکے گا لیکن آنحضرت ﷺ کے بعد ایک دوسرے نام سے رشد وہدایت کا یہی سلسلہ جاری رہے گا اور اس کا ماننا اور تسلیم کرنا ہمارے لئے اتنا ہی ضروری ہو جتنا سلسلہء نبوت کا، تو واقعہ وعمل کے اعتبار سے اجرائے نبوت اور اجرائے امامت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص توحید کے یہ معنی لیتا ہے کہ کسی شخص پر لفظ اللہ کا اطلاق نہیں ہوسکتا کسی کو رب اور پروردگار نہیں کہہ سکتے لیکن عملاً ایسے مرکزوں سے اس کی عقیدت ومحبت برابر وابستہ ہے جو اختیارات کے اعتبار سے کسی طرح بھی اللہ سے کم نہیں تو کیا آپ اسے توحید ہی قرار دیں گے اور شرک نہیں سمجھیں گے۔ جس طرح توحید کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ غیر اللہ کے

سامنے جھکنا تو جائز نہیں لیکن سجدہ کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھا جائے اور ضروریات اور مشکلات کے وقت اس کو پکارنے اور اس سے استمداد واعانت چاہنے میں بھی کوئی گناہ نہ متصور ہو، صرف اتنی احتیاط البتہ ملحوظِ خاطر رہے کہ اس غیر اللہ کو اللہ کے نام سے متصف نہ کیا جائے۔

ٹھیک اسی طرح سے ختم نبوت کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی اطاعت وانقیاد کے چور دروازے کھلے ہیں۔ یعنی اب بھی انسان مجبور ہے کہ مستقلاً ایک سلسلۂ رشد وہدایت مانے اور اپنی عقیدت ومحبت کا اسے مدار اور محور قرار دے۔ ہاں ختم نبوت کے اعتراض سے بچنے کے لئے اس نوع کے سلسلہ کو جو باعتبارِ واقعہ قطعی نبوت کے مترادف ہے۔ نبوت کا سلسلہ نہ ٹھہرائے بلکہ اس پر امامت کی چھاپ لگائے۔

امامت ونبوت میں جو فرق حضراتِ شیعہ کے یہاں ہے وہ نام اور چھاپ کا تو ضرور ہے حقیقت ومعنی کا ہرگز نہیں۔ اس کے برعکس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نبوت ایک ایجابی حقیقت کا نام ہے اور ایک مثبت معنی سے تعبیر ہے وہ حقیقت ومعنی سوا اطاعتِ مفروضہ اور بلا شرط وانقیاد کے اور کوئی چیز نہیں۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ خاتم النبیین ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد اب کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کی اطاعت ہم پر فرض ہو' جس کا ماننا ضروری ہو اور جو ہمارے لئے اسوہ ونمونہ قرار پاسکے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہمیشہ کیلئے اطاعت وعقیدت کا ایک مرکز ہمارے لئے مقرر کردیا گیا ہے۔

اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بجز آنحضرت ﷺ کی اطاعت وانقیاد کے اور تمام دروازوں کو امت محمدیہ ﷺ پر بند کردیا گیا ہے۔ یعنی نبوت کے جن کواڑوں کو بند کیا

گیا ہے وہ صرف نام اور چھاپ کے کواڑ نہیں، حقیقت و معنی کے کواڑ ہیں۔

کوئی انسان معصوم نہیں ہو سکتا

اسلامی نقطہ نظر سے بجز انبیاء علیہم السلام کے ہر ہر شخص گناہ و معصیت کی دلآویزیوں پر ریجھ سکتا ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ اسے عقل و خرد کی جو حقیر پونجی دی گئی ہے، وہ گناہوں سے نمبرد آزما ہونے کی صلاحیتوں سے یک قلم محروم ہے اور کچھ اس لئے کہ الہام و وحی کی روشنی کے بغیر خود عقل نامکمل اور ناقص ہے۔ نفسیات کے جدید ترین اکتشافات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان اپنے اعمال اور زندگی کے ظہورات میں اتنا معقول پسند نہیں ہے جتنا کہ نفس کی تحریکات کے مقابلہ میں مجبور ہے۔ یعنی یہ جو چار دانگِ عالم میں اس کی منطق آرائی اور فلسفہ دانی کے ڈھنڈورے پٹ رہے تھے۔ اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ خارجی دنیا میں اس کے اقتدار و سطوت کا چاہے کتنا چرچا ہو اور وہ صحیح بھی ہو۔ باطن کی ابھری ہوئی اور فعال خواہشات سے عہدہ برا ہونے کی تو اس میں مطلق سکت نہیں کیونکہ عقل و خرد کا مزاج ہی ایسا ہے کہ یہ اپنے اندر فعال رہنمائی کی صلاحیتیں بالکل نہیں رکھتی۔ اس کے کام کا ڈھنگ اس طرح کا ہے کہ یہ تعرض نہیں کرتی اور آخر آخر میں تو ترغیبات کے مقابلہ یہ اتنی مغلوب ہو جاتی ہے کہ اس کا کام فقیہِ شہر کی طرح صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جب ایک برائی ہو چکے تو یہ اس پر جواز کی مہر ثبت کر دے۔ البتہ نبوت کی عقل ایسی ہوتی ہے جس میں حقانیت کی جھلک ہے اور جو گناہوں سے نمٹنے کی پوری پوری صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو یہ منظور ہے کہ کائناتِ انسانی کیلئے کچھ اسوہ و نمونہ کی روشن سطحیں کروٹ نہ لیں اور پھر اس عقلِ فعال و پاک میں

بھی بشریت کی اتنی رعائت موجود ہے کہ اجتہاد وفکر کی لغزشوں کا برابر امکان موجود ہے۔ و نسی ادم اول الناس اول ناس لہٰذا کسی انسان کو جب اس کا مزاجِ بشری یہی ہے، معصوم ٹھہرانا قطعی غیر عقلی اور غیر اسلامی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے باب میں عصمت کا ماننا تو اس لئے درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام فرمایا ہے کہ انہیں فکر وعمل کی کسی لغزش پر قائم نہ رہنے دیا جائے لیکن آئمہ کے باب میں اس ڈھنگ کے اہتمام کا کہیں ذکر نہیں۔

مذہب کا مطالبہ

انسانی فطرت کی اسی کمزوری کے پیش نظر کہ یہ ترغیباتِ نفس کا آسانی سے شکار ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے گناہوں کے معاملہ میں کلی احتراز کا مکلّف نہیں گردانا' یعنی اس سے مذہب کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ اس سے کبھی گناہ کا صدور نہ ہو یا کبھی اس کے ذہن وفکر میں لغزش کروٹ نہ لے بلکہ صرف اور صرف اس قدر ہے کہ یہ حتیٰ المقدور پاکبازی ونیکی کے معیاروں کو قائم رکھنے کی سعی کرے اور اس پر بھی اگر گناہ و معصیت کی جاذبیتیں اسے بہکا ہی دیں تو فوراً متنبہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے آگے بخشش کے لئے دعا وطلب کے ہاتھ پھیلا دے۔

وَاِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ

(الانفال : ۲۰۰)

"اور اگر شیطان کی طرف سے کوئی تحریک تمہیں محسوس ہو تو اللہ سے پناہ مانگو وہ یقیناً سننے والا اور تمہاری فطری کمزوریوں کو جاننے والا ہے"۔

عصمتِ آئمہ کا عقیدہ کیونکر پیدا ہوا

ان حالات میں عصمت آئمہ کا عقیدہ حضرات شیعہ میں کیونکر پیدا ہوا جبکہ اس کے لئے کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ میں کوئی نص موجود نہیں اور جب کہ یہ عقیدہ خلافِ عقل بھی ہے۔ اس کا جواب معلوم کرنے کیلئے اولاً اس تاریخی پچھواڑ اور بیک گراؤنڈ پر غور کرنا چاہئے جس نے اس عقیدہ کیلئے راہیں ہموار کیں۔ یہ ظاہر ہے خلافتِ راشدہ تک شیعی اختلاف کی نوعیت غیر سیاسی تھی۔ حضرت علیؓ دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ بر بنائے قرابت داری، خلافت کا حق آنحضرت ﷺ کے بعد انہی کو پہنچتا ہے جبکہ دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا مزاج شورائی ہے۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران : ۱۰۹) "اور آپ ﷺ معاملات میں مشورہ کرلیا کیجئے"۔

اس لئے خلیفہ وہ قرار پائے گا جس پر صحابہ ؓ کی معتد بہ جماعت جمع ہو گی۔ حضرت علیؓ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں کیا کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ یہ محض ایک تعبیر ہے اور اس کی دوسری تعبیر وہ ہے جو ان کے علاوہ جلیل القدر صحابہ ؓ نے اختیار کی۔ حضرت علی ؓ کے بعد بنی امیہ کے دور میں اس سیاسی اختلاف نے بالکل دوسرا ڈھنگ اختیار کیا۔ اب تک روزمرہ کی عملی زندگی پر اس اختلاف کی کوئی پرچھائیں نہ پڑی تھیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ اور ان کے اتباع اسی انداز سے نمازیں پڑھتے تھے جس طرح دوسرے صحابہ ؓ اسی طرح روزے رکھتے تھے جس طرح دیگر صحابہ ؓ یعنی زندگی کے تمام ظہورات میں ان کا اسلام عامۃ المسلمین کے اسلام سے کسی طرح مختلف نہیں تھا مگر جب یہ تلخیاں بنوامیہ کی بیہودگیوں کی وجہ سے بہت

زیادہ بڑھیں تو شیعیت میں بھی ردعمل کے طور پر شدید عصبیت پیدا ہوئی۔

شیعیت اسلام کے خلاف ایک سازش

تاریخ کے اس موڑ پر ایران کی مغلوب مجوسیت اور کچلی ہوئی یہودیت میں سازش ہوئی اور یہ طے کیا گیا کہ اسلام سے اس کے غلبہ وتفوق کا انتقام لینا اس طرح ممکن ہے کہ آپس کے اس اختلاف کو اپنایا جائے۔ اس میں اپنا مخصوص عقیدہ اور روح داخل کی جائے اور اس کو ایسی شکل میں ڈھالا جائے کہ بظاہر یہ اسلام کا ایک فرقہ ہی رہے مگر اسلام کی کوئی ادا اور اسلام کا کوئی حسن اس میں باقی نہ رہے۔ یعنی اس کے عقیدوں کے محور یک قلم بدل دیئے جائیں۔ اس میں اطاعت ومحبت کی سمتیں بھی از سر نو متعین ہوں اور ایک ایسا متوازی نظام تجویز کیا جائے جو بتدریج اثرات ونتائج کے اعتبار سے اسلام کا حریف اور مدمقابل ثبت ہوسکے۔

ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ یہ سازش کامیاب رہی' اسلامی تاریخ کا معمولی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر جو جو آفتیں آئیں ان کی تہہ میں یہی تصور کارفرما تھا جس کو مجوسیت اور یہودیت نے پیدا کیا۔ اس سازشی گروہ کے سامنے دشواری یہ تھی کہ اگر یہ اسلام کے اسی ڈھانچے کو قائم رہنے دیتے ہیں جس کو آنحضرت ﷺ نے پیش کیا اور عقیدت ومحبت کے دائروں کو نبوت تک محدود رکھتے ہیں اور ماتھوں کو دوسرے آستانوں پر نہیں جھکاتے تو اس سے یہ خدشہ لاحق ہے کہ مخالفت وعناد کی وہ فضا بگڑتی ہے جس کی تلخیوں میں عمداً اضافہ کیا گیا اس لئے نبوت کے مقابلہ میں امامت کو لامحالہ لانا پڑا۔ آپ اگر شیعہ کتب وروایات کا مطالعہ کریں گے تو ایک چیز جو آپ کی توجہ کو اس طرف موڑے گی وہ یہ ہوگی کہ یہاں اللہ اور

رسول ﷺ کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو آئمہ کو ہے۔ یہاں فضائل و مناقب اور معجزات ورسالت کی کورکو بہر آئینہ دبی ہوئی نظر آئے گی اور یوں معلوم ہوگا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ اور آئمہ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں معاذ اللہ یہ دوسرے درجے پر ہیں۔ اسی لٹریچر کا اثر ہے کہ ایک شیعہ نفسیاتی طور پر مجبور ہے کہ وہ محبت و وابستگی اور لگاؤ اور تعلقِ خاطر کی ہر ہر کیفیت کو صرف آئمہ اہلِ بیت تک محصور رکھے اور اس حقیقت کو نہ سمجھے کہ اصل میں مقصود بالذات تو اسلام ہے اور یہ وہ کسوٹی اور معیار ہے جس کی نسبت سے فضائل و مناقب کی قدریں متعین ہوتی ہیں، یعنی اسلام میں اطاعت و عقیدت کے لئے ایک اصول متعین ہے جس کی رعائت بہر آئینہ ضروری ہے۔

فرقِ مراتب

یہ اصول فرقِ مراتب کا ہے اس میں جو شے محبت و عقیدت کے لائق ہے وہ خود اللہ تعالیٰ کی ذات بے ہمتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرة:١٦٥)

"اور وہ لوگ جو مومن ہیں، وہ اللہ کو زیادہ چاہتے ہیں" پھر دوسرے درجہ پر محبت و عقیدت کا محور آنحضرت ﷺ کا اسوہ حسنہ ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران:٣١)

"اے رسول ؐ کہہ دو کہ اگر تمہیں واقعی اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی اختیار کرو اس پر خود اللہ تمہیں چاہنے لگے گا" تیسرے درجہ پر صحابہ رضی اللہ عنہم اور آئمہ اہل بیت ہیں جن میں پھر ایک ترتیب ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ

بِاِحۡسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ (التوبه : ۱۰۰)

''اور مہاجرین و انصار میں سے جن لوگوں نے سبقت کی اور وہ لوگ جو ان کے بعد خلوص دل سے داخلِ ایمان ہوئے اللہ ان سے خوش اور وہ اللہ سے خوش''

غرضیکہ جب عصبیت و سازش نے مل کر ایک نیا روپ دھارا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ عقیدت و محبت کی موجودہ سمتوں کو بدلا جائے کیونکہ اگر محبتوں کے باب میں توازن اور فرقِ مراتب کا یہ انداز قائم رہتا ہے تو پھر یہ سازش کامیاب نہیں رہتی اور اس اختلاف کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں رہتی جو صحابہ سے ہے کیونکہ یہی تو دین کے حامل و سرچشمہ اور مبلغ ہیں، انہی کی وساطت سے دین ہم تک پہنچا ہے۔

عصمتِ آئمہ کے عقیدے کو ماننے کی ضرورت یوں بھی محسوس ہوئی ہے کہ شیعہ حضرات چونکہ اصولاً ان ذرائع ہی کے قائل نہیں جن سے احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ ہم تک منتقل ہوا۔ مزید برآں ان کے ہاں ہمیشہ سیاسی خلفشار میں رہنے کی وجہ سے کوئی سلسلہء روایت مرتب نہ ہو سکا جو آنحضرت ﷺ تک پھیلا ہوا ہو اور جس کی ایک ایک کڑی نقادان فن کے سامنے ہو۔ اس لئے مرویات کے اس نقص کو چھپانے اور جرح و نقد کے تیز کانٹوں سے بچنے کیلئے ''عصمتِ آئمہ'' کا ایک ''عقیدہ'' گھڑا گیا تاکہ جب بات ان کی طرف منسوب ہو جائے تو اس پر کوئی رائے زنی نہ ہو سکے اور چپ چاپ سے مان ہی لیا جائے۔

ختم نبوت ایک مثبت عقیدہ

غرض جہاں تک ختم نبوت کے حدود کا تعلق ہے اس میں یہی چیز داخل نہیں کہ آپ آنحضرت ﷺ کے بعد کسی نبوت کے قائل ہیں یا نہیں۔ یہ شے بھی داخل ہے

کہ عقیدت ومحبت کے نئے نئے محوراب تلاش نہیں کیئے جائیں گے اور قیامت تک کیلیئے یہ کافی ہوگا کہ کتاب وسنت کی روشنی سے استفادہ کیا جائے۔اب کسی کی ذات کا ماننا یا نہ ماننا کفرو اسلام اور ہدایت وگمراہی کا معیار نہ بن سکے گا اور کوئی شخص بھی اس مئوقف پر فائز نہیں ہوگا کہ اس کی وجہ سے ہدایت رہنمائی کی سمتیں بدل جائیں اور کوئی عصبیت اور گروہ بندی جائز نہ ہوگی جس سے کہ کتاب وسنت کا مرتبہ ثانوی ہو جائے۔ختم نبوت ایک مثبت اور ایجابی عقیدہ ہے اور ایک طرح کا پیرایہ بیان ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی والہام کا وہ انداز جو اطاعت وتعبد کا مقتضی ہے تکمیل تک پہنچ چکا اور ہدایت کے تمام مضمرات نکھر کر نگاہِ اعتبار کے سامنے آ چکے۔اب یہ کسی جماعت کیلیئے روا نہیں کہ ان سے ہٹ کر عقیدت ومحبت اور اطاعت وفرمانبرداری کے اور اور صنم خانے تعمیر کرے۔اب ہمیشہ ہمیشہ کیلیئے دینی اقدار کو معین کر دیا گیا اور واشگاف طور پر بتا دیا گیا کہ توحید میں کن کن نزاکتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ عبادات کی کیا کیا شرائط اور تفصیلات ہیں۔ معاشرت اور تدبیرِ منزل کے کیا کیا اصول ہیں اور سیاسی واقتصادی رجحانات کو کن کن سانچوں میں ڈھالنا چاہیئے۔

جب یہ سب کچھ ہو چکا تو ہمیں بتایا جائے کہ اجرائے نبوت سے کیا مقصود ہے؟ اب اگر کوئی صاحب نبوت وعصمت کا لبادہ اوڑھ کر جلوہ گر ہو ہی جائیں تو ہمیں کن نئے مسائل کی تلقین کریں گے جن کو اب تک ہم نے نہیں سنا اور کن جدید حقائق کی طرف توجہ دلائیں گے جن سے ہماری اپنی بصیرت آشنا نہیں ہوئی۔اگر واقعہ یہ ہے کہ کوئی کیفیتِ منتظرہ باقی نہیں رہی اور اسلام نے ہر ہر شے کی

پوری پوری وضاحت کر دی ہے تو دنیا وعقبیٰ کی سعادتوں سے بہرہ مند ہونے کیلیئے یہ کافی ہے۔

دراصل یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اس وقت مسلمانوں کے سامنے اشکال کیا ہے؟ اشکال یہ نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات ہو چکی یا وہ زندہ آسمان پر موجود ہیں' اشکال یہ بھی نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد نبوت کا کوئی امکان ہے یا نہیں' اشکال یہ ہے کہ اسلام نے جن اصولوں کی وضاحت کی ہے اور زندگی کی عملی گتھیوں کو جس انداز سے سلجھایا ہے اس وقت ان اصولوں کو کیونکر رائج کیا جائے اور اس انداز کو کس طرح اپنایا جائے۔

اگر نئی نبوت ہماری مشکلات کا حل ہوتی، یا عصمتِ آئمہ کا عقیدہ ہمیں ادبار و تسفل کے دائروں سے نکال سکتا تو آج ہم یقیناً زندگی کے مختلف میدانوں میں کامیابی سے تگ و تاز کر سکتے مگر آپ نے دیکھ لیا کہ اس ڈھنگ کے مزخرفات سے ہمیں نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ الٹا نقصان پہنچا ہے۔ اس لئے آؤ! ان سب کو چھوڑ کر کتاب و سنت ہی کو آزمائیں اور اپنی توجہ کو دوسری تمام سمتوں سے ہٹا کر اسی ایک سمت پر مرکوز کر دیں اور اس کے بعد بھی اگر ہم کامیابی سے ہمکنار نہ ہوں تو پھر بلا شبہ کسی نئی روشنی کی طرف دوڑنا اور کسی نئی حکمت کی پیروی کرنا ہمارے لئے ضروری ہو جائے گا۔ لیکن اس وقت بھی مرزا صاحب کا ظہور و ادعاء افسوس ہے کہ ناقابل التفات ہوگا کیونکہ ان کے وسیع و عریض لٹریچر میں عمل و سعی کے تقاضوں کا کوئی جواب مذکور نہیں۔ اس میں جو کچھ ہے اس کو ان تین لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ دعاوی' پیش گویاں اور ان کو حق بجانب ثابت کرنے کی ناکام کوشش اور بس۔

قادیانی الگ قوم

- کیا قادیانی الگ قوم ہیں؟
- تاویلات کے مختلف مدارج
- قوم کسے کہتے ہیں؟
- جذبات کا اختلاف
- یہ مناظرانہ اپچ نہیں
- چوہدری ظفر اللہ کا عارضی اقتدار
- آئندہ دستور میں مرزائیوں کی جگہ
- مسئلہ ختم نبوت اور اقلیت
- مذہب و ریاست کے موجودہ تقاضے اور نبوت

فرقہ . . یا . . . اقلیت

کیا قادیانی ایک الگ قوم ہیں؟

(ایک علمی بحث)

فرقہ یا اقلیت

یہ مسئلہ خالص دستوری و آئینی ہے کہ قانونی چوکھٹے میں مرزائیوں کی کیا حیثیت ہو؟ انہیں مسلمانوں کا ایک گمراہ فرقہ، ایک برخود غلط شاخ اور جادہ حق و صداقت سے ہٹی ہوئی ایک جماعت قرار دیا جائے یا مستقل قوم، الگ مذہب اور مخصوص اقلیت سمجھا جائے؟

ختم نبوت کے ضمن میں ہم نے عرض کیا تھا کہ جہاں تک اسلامی نقطہ نظر کا تعلق ہے ختم نبوت بنیادی مسئلہ ہے اور اس میں قطعاً اتنی لچک نہیں ہے کہ مرزائی علم الکلام کی تاویلاتِ فاسدہ کا متحمل ہو سکے کیونکہ تاویلات کے لئے کچھ علمی شرائط ہیں، ادب و نحو کی پابندیاں ہیں اور اسلامی ذہن کے ساتھ سازگاری کی ایسی قیود ہیں جن کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو قادیانی تحریفات کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔

تاویلات کے مختلف مدارج

ہم نے اس تنقیح کو بھی واضح کیا تھا کہ ختمِ نبوت کے معاملہ میں قادیانی برتاؤ کو تاویل قرار دینا اس اعتبار سے تو صحیح ہے کہ اصطلاح میں بہر آئینہ اسے تاویل ہی ٹھہرایا جائے گا لیکن اگر تاویل کے مختلف مدارج ہیں اور ہر ہر درجہ اپنا الگ حکم رکھتا ہے تو پھر جس درجہ کی تاویل ہے اس کے ڈانڈے

معانی کے اعتبار سے انکار سے ملے ہوئے ہیں۔

قوم کسے کہتے ہیں

ہم نے اس نکتہ کی بھی تشریح کی تھی کہ جب ایک گروہ عملاً معاشرہ میں اپنی جداگانہ حیثیت قائم کر لیتا ہے' اپنی عصبیت اور تعلقات و وابستگی کے اعتبار سے کچھ نئے مرکزوں کو اپنا لیتا ہے' تو وہ ایک الگ قوم ہی رہے گا۔ اگرچہ بعض چیزوں میں یا اکثر چیزوں میں وہ دوسروں سے اشتراک رکھتا ہو کیونکہ قومیت کی صحیح صحیح تعریف یہی ہے کہ ہر وہ رشتہ جو آپ میں عصبیت کی لہروں کو تیز کر دیتا ہے عقیدت کی سمتوں کو بدلتا ہے اور آپ میں دوسروں سے مختلف نوع کے جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے قومیت سے تعبیر ہے۔ اس کسوٹی پر قادیانی حضرات کو پرکھئے' ان کی نمازیں الگ ہیں' مساجد جداگانہ ہیں اور معاشرتی اعتبار سے اتنی بیگانگی ہے کہ کوئی قادیانی عام مسلمانوں سے رشتہ ناطہ جائز نہیں سمجھتا۔

جذبات کا اختلاف

پھر جذبات کے لحاظ سے بھی اتنی دوئی کہ آپ جن باتوں سے خوش ہوتے ہیں وہ ان کے لئے مطلق خوشی کا سبب نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً آپ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں خالص اسلامی نظام رائج ہو مگر قادیانی اخبارات نے ہمیشہ اس رائے کی مخالفت کی۔ آپ کی یہ خواہش ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کی جو لکیر کھینچ دی گئی ہے اب یہ قائم رہے بلکہ زیادہ گہری اور مضبوط ہوتی جائے مگر قادیانی اس خواہش کے اظہار میں قدرتاً مخلص نہیں ہو سکتے کیونکہ ایک تو ان کا قادیان ہندوستان میں رہ گیا ہے دوسرے اس تقسیم سے آدھی جماعت "خلیفہ المسلمین" کی ہدایات و فیوض سے محروم ہو گئی ہے۔ لہٰذا جب عقیدہ اور

عندیات کے اعتبار سے وہ بالکل دوسری طرح کے محسوسات رکھتے ہیں تو پھر خالص سیاسی نقطہ نظر سے انہیں کیوں الگ قوم نہ کہا جائے۔

یہ مناظرانہ اپچ نہیں

ہم صرف اس نکتے کی اور وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ عام قادیانی حضرات ہماری اس رائے کو محض مناظرانہ اپچ قرار دیں اور بظاہر مخالفت کریں۔ مگر ان کے خواص جانتے ہیں کہ یہی وہ مطالبہ ہے جس کو منوانے کے لئے خود ظفر اللہ نے زور دیا اور ہندوستانی نمائندہ سر سیتلواد سے یہ کہا کہ ہندوستان میں قادیانیوں کو ایک اہم اقلیت قرار دیا جائے۔ اگر عام قادیانی سوچیں گے تو انہیں معلوم ہو گا کہ اس میں انہیں کا فائدہ ہے وہ ایک مرتبہ اس پوزیشن کو مان لیتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آہستہ آہستہ ان سے پاکستان میں وہی برتاؤ ہونے لگے گا جو دوسری اقلیتوں سے ہوتا ہے' اور اگر وہ فرقہ کی حیثیت سے ان حقوق و مفادات پر قابض ہونا چاہیں گے جو عام مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کے خلاف تلخیاں زیادہ تیزی سے ابھریں گی اور یہ کبھی بھی کسی حلقہ سے انتخاب جیت نہیں سکیں گے۔(۱)

چوہدری ظفر اللہ کا عارضی اقتدار

چوہدری ظفر اللہ کے موجودہ اثر و رسوخ سے الگ ہو کر انہیں سوچنا چاہئے کہ ان کا حقیقی فائدہ کس بات میں مضمر ہے؟ کیونکہ جلد یا بدیر چوہدری ظفر اللہ کا یہ اثر بہر آئینہ ان سے چھننے والا ہے۔ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ بڑی سے بڑی ملازمتیں بھی کسی گروہ کے لئے کوئی تحفظ نہیں ہوتیں۔ حقیقی تحفظ یہ ہے کہ پاکستان کے دستور میں ان کے لئے مخصوص اقلیت کی حیثیت سے جگہ

ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تجویز ان کے حق میں اتنی ہی مفید ہے تو ہم اس کی کیوں تائید کر رہے ہیں؟ جواب یہ کہ دو وجہ سے' ایک تو یہ کہ جب یہ ہم سے الگ ایک گروہ ہیں' دینی اور ذہنی اعتبار سے ان کا راستہ ہم سے جدا ہے' تو کیوں وہ دستور کے لحاظ سے یہ ہم سے الگ نہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ عالم اسلام چونکہ ان کے تفصیلی عقائد سے آگاہ نہیں اس لئے فرقے کی حیثیت سے انہیں موقع ملتا ہے کہ ان کو گمراہ کریں اور اپنے غلط پراپیگنڈے سے ان کے عقیدوں کو متاثر کریں چنانچہ دنیائے اسلام میں یہ ہمیشہ اس روپ سے متعارف ہوتے ہیں کہ ہم ایک تبلیغی جماعت ہیں اور اسلام کی سربلندی اور استحکام کے لئے کوشاں ہیں حالانکہ مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ مرزائیت کی اشاعت ہو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تلبیس و فریب کاری کے اس فتنہ کا انسداد ہو' عالم اسلامی کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ پاکستان میں ان کی آئینی حیثیت کیا ہے؟ تو پھر وہ ان کے دام میں نہیں پھنسیں گے۔(ا)

مولف علام طاب اللہ ثراہ نے یہ بات ارشاد فرمائی کم و بیش 1974ء سے بیس برس قبل' ان کے دیدۂ بینا نے کتنی پر حقیقت بات فرمائی تھی جس کی تصدیق 1974ء میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے بعد کے عالم اسلامی کے رد عمل سے ہوئی کہ جونہی یہاں انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا معاًبعد عالم اسلام کے اکثر ممالک اور بیشتر مسلم تنظیمات نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا اور ان کے خلاف عملی کاروائیاں کیں۔ ان کے خلاف رسائل و جرائد میں نہایت قیمتی معلوماتی مقالات تسلسل سے اشاعت پذیر ہونے لگے یہاں کی دینی و سماجی تنظیموں' اداروں اور حکمران و حکام اور علماء کے نام مبارک باد دی۔ تاروں کے انبار لگ گئے۔
متعدد عدالتوں نے انہیں قانونی طور پر غیر مسلم اقلیت اور کافر قرار دیا۔ یہ بہت تفصیل طلب باتیں ہیں۔ جس طرح مرزائیوں کے دجل و فریب کا جادو عالم اسلام کے اکثر ممالک میں تبلیغ کے نام پر چلتا رہا یہ بات بعید از قیاس تھی کہ انہیں اتنی جلدی ہر طرف سے

ہم اس شے کے لئے تیار ہیں کہ انہیں ایک اقلیت سمجھیں اور ان سے اسی طرح کا برتاؤ کریں جس طرح اقلیت سے کرنا چاہئے۔ لیکن ہم اس پر آمادہ نہیں ہیں کہ انہیں اسلام کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔

آئندہ دستور میں مرزائیوں کی جگہ

یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے کہ مرزائیت کا مقام اسلامی فرقوں میں کیا ہو؟ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ایک صحبت میں ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ انہیں بہر آئینہ مؤولین ہی میں شمار کرنا چاہئے اب جبکہ پاکستان نے ایک نئی سیاسی کروٹ لی ہے تو اس میں خواہ کوئی نظام حکومت چلے اتنا تو ہو گا ہی کہ دستور میں ان کی حیثیت کو متعین کیا جائے اور اس حیثیت کے مطابق ان کے حقوق کی وضاحت ہو۔ ہمیں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ تاویل کے ہر ہر مرتبہ کا ایک ہی حکم ہو' تاویل کی اصطلاح میں اتنی لچک نہ ہونا چاہئے کہ اسلامی مزاج و نصوص کی صریحاً مخالفت کے باوجود کوئی گروہ اسلام کے دائرے سے نہ نکل سکے۔ اگر تاویل کے مراتب مختلفہ کا لحاظ کئے بغیر اس کی ہر ہر صورت کو جائز گوارا کیا گیا تو پھر انکار و ارتداد کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔ فرض کیجئے ایک شخص غیراللہ کی پوجا کرتا ہے اور اس شرک خالص کے لئے اس سے استدلال کرتا ہے کہ خود اللہ نے اپنے لئے جمع کے صیغوں کو اور جمع کے ضمائر کو استعمال کیا ہے لہٰذا ضرور اسلام میں شرک کی گنجائش موجود ہے' تو اسے جائز تاویل

مایوسیوں کے اتھاہ سمندروں میں غوطے لگنے لگے۔ لیکن ہوا وہی جو حضرت ندوی نور اللہ مرقدہ نے فرمایا تھا کہ "عالم اسلامی کو اگر یہ معلوم ہو جائے گا کہ پاکستان میں ان کی حیثیت کیا ہے تو پھر وہ ان کے دام میں نہیں پھنسیں گے" رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ و مغفرۃ۔(خالد اشرف)

نہیں کہا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کونوا قردۃ خاسئین سے تناسخ پر استدلال کرتا ہے یا بہائیوں کی طرح آیات قیامت کی تاویل کرتا ہے تو اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اس لئے قادیانیوں کے مذہبی موقف کو متعین کرنے کیلئے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ قطع نظر اس کے کہ وہ اجراء نبوت تک استدلال کے کن پر پیچ راستوں سے پہنچے ہیں خود ختم نبوت کا عقیدہ ہمارے ہاں کس نوعیت کا ہے۔ اگر نبوت اکمال و اتمام کی ان منزلوں تک پہنچ چکی ہے کہ اب کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں رہی' اگر آنحضرت ﷺ نے دین کے تمام مضمرات کو بیان فرما دیا ہے تو آپ ﷺ کے بعد کسی نئے ڈھونگ کی نہ صرف یہ کہ ضرورت باقی نہیں رہتی ہے بلکہ نئی نبوت کے ماننے سے آنحضرت ﷺ کے ساتھ جو دلی لگاؤ ہے اس میں فرق آتا ہے کیونکہ جب نیا نبی آئے گا تو لامحالہ وہ نئے گروہ کی بنیاد رکھے گا' نئی عصبیتوں کو اجاگر کرے گا اور توجہات و وابستگی کے پرانے مرکزوں سے لوگوں کو ہٹا کر ان کا رخ اپنی طرف موڑے گا۔

لہٰذا قادیانیت کی یہ حیثیت ہرگز نہیں ہو سکتی کہ وہ کوئی فرقہ ہے یا اسلام کی کوئی شاخ ہے بلکہ وہ ایک مذہب قرار پائے گا جس طرح یہودیت کے بعد عیسائیت ہے اور وہ یہودیت کا کوئی فرقہ نہیں۔ عیسائیت کے بعد اسلام ہے اور اسلام عیسائیت کی شاخ نہیں بلکہ مستقل دین ہے جس نے منفرد عقائد و معاشرہ کی بنیاد رکھی۔ ٹھیک اسی طرح قادیانیت اسلام کے بعد ایک مذہب ہے۔ صرف اشتراک عقائد سے بات نہیں بنے گی کیونکہ بنیادی مسائل میں یہودیت عیسائیت سے الگ تعلیمات کا نام نہیں اسی طرح عیسائیت اسلام سے مختلف نہیں تاہم یہ الگ الگ مذہب ضرور ہیں۔ اسی طرح قادیانیت بھی اشتراک عقائد کے

باوجود ایک الگ مذہب ہے۔

صرف ایک فرق البتہ ان مذاہب میں اور قادیانیت میں ہے اور وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے سچے نبی ہیں اور مرزا صاحب جھوٹے۔ مگر اس میں نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ نبی سچا ہو یا جھوٹا بہر آئینہ جب وہ آنحضرت ﷺ کے بعد آ کر لوگوں سے اپنی نبوت منواتا ہے اپنے گرد لوگوں کو جمع کرتا اور مسلمانوں کے دینی مزاج کو بدلتا ہے تو لامحالہ وہ نئے مذہب کی بنیاد رکھتا ہے۔ ہماری رائے میں خود قادیانیوں کو اس بات پر اصرار نہیں کرنا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کی ایک شاخ ہیں کیونکہ وہ خود ایسا نہیں سمجھتے۔ یہی سبب ہے کہ وہ دیانتداری سے عام مسلمانوں کے ساتھ رشتہ داری کو ممنوع گردانتے ہیں ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور ان کے جنازوں میں شریک نہیں ہوتے لہٰذا خود ان کے لئے یہی مناسب ہے کہ یہ ایک قوم کی حیثیت سے پاکستان میں رہیں۔ اقلیت کی یہ رعائت بھی ان کے لئے بس ایک ناگزیر رعایت ہے جو حالات کی مجبوریوں سے دی گئی ہے ورنہ خالص اسلامی طرز عمل تو وہی ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے مقابلہ میں اختیار کیا۔ یہاں کی ریاست چونکہ "مشترکہ جدوجہد" کے "اصول" پر منصہ شہود پر آئی ہے اس لئے قانون مجبور ہے کہ انہیں شہریت کے تمام حقوق بخشے اور ان کی حفاظت کرے۔

ہمارے نزدیک ایک تعلیم کی حیثیت سے قادیانیت کا موسم گذر گیا ہے اس کے پاس موجودہ پود کے لئے کوئی پیغام نہیں اس دور کے لئے اس کے دامن میں کوئی شے نہیں تعجب یہ ہے کہ اتنا کھوکھلا مذہب کیونکر رائج ہو گیا۔

بات یہ ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد طبیعتوں میں ایک طرح کی مایوسی تھی ایک طرف انگریز اور امریکہ کے پھیلائے ہوئے پادری اسلام پر حملہ کر رہے تھے' دوسری طرف دیانند اسلام کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ مولانا محمد علی مونگیریؒ مولانا ثناء اللہؒ صاحب مرحوم امرتسری اور قاضی سلیمان صاحب سلمان منصور پوریؒ ان کے جواب میں سنجیدہ اور متین علمی لٹریچر کا انبار لگا رہے تھے مگر اس میں وہ ادعاء نہ تھا ہمیشہ مسلمانوں نے جس سے دھوکہ کھایا۔

مرزا صاحب نے اس نفسیاتی ماحول سے فائدہ اٹھایا اور حامی اسلام کے روپ میں میدان مناظرہ میں کود پڑے اور پھر ادعاء ولاف زنی کے ایسے ایسے کرشمے دکھائے کہ یہ حضرات اس فن میں ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔

انگریز کے دامن فتنہ پرور نے اس آگ کو ہوا دی' پھر کیا تھا انگریزوں کا یہ خود کاشتہ پودا دیکھتے ہی دیکھتے شعلہ جوالہ بن گیا' اب وہ فضا جو مرزائیت کے لئے سازگار تھی باقی نہیں رہی۔ انگریز کی سرپرستی ختم ہو چکی ہے' پادریوں کا زور بھی ٹوٹ گیا ہے' مباحثہ و مناظرہ کی بساط بھی الٹ چکی ہے اور چونکہ اس کے پاس کوئی پیغام نہیں اس لئے یہ اب صرف چوہدری ظفر اللہ کے انجکشنوں پر زندہ ہے۔ لہٰذا ان سے کوئی بحث یا لڑائی نہیں اور نہ اب اس سے کچھ فائدہ ہی ہے' ہم ان کو جھوٹا مانتے ہوئے بھی یہ رعائت ان سے برتنا چاہتے ہیں کہ انہیں اقلیت کی حیثیت سے آئندہ دستور میں جگہ دی جائے۔



مسئلہ ختم نبوت اور اقلیت

مسئلہ ختم نبوت ایک اصولی مسئلہ ہے جس طرح یہ حقیقت ہے کہ خدا ایک ہے۔ رسالت و نبوت کا ایک متعین مفہوم ہے اور حشر و نشر کی معلوم و معروف کیفیتیں ہیں جو کتاب و سنت میں مرقوم ہیں اور اللہ کے ہاں جوابدہی اور باز پرس کا عقیدہ ہے جو امت کے مسلّمات میں سے ہے۔ اسی طرح یہ تصور تمام امت میں متفقہ طور پر دائر ہے کہ اسلام کے بعد کوئی دین نہیں اور آنحضرت ﷺ کی نبوت و تعلیمات جن منزلوں کی نشاندہی کرتی ہیں ان کے آگے معرفت و حکمت کی کوئی منزل نہیں۔ یہی وہ اساس ہے جس پر ہماری پوری دینی عمارت استوار ہوتی ہے اور یہی وہ مدار و محور ہے جس کے گرد عصبیت و تعلقِ خاطر کی تمام شکلیں گردش کرتی ہیں۔ گزشتہ چودہ سو برس میں کیا کیا فتنے نہیں اٹھے اور فکر و خیال کی کون کون سی گمراہی ہے جو برپا نہیں ہوئی بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ لغزشِ و گمراہی کی جتنی صورتیں عقلاً ممکن تھیں۔ ان سب کا وقوع اور فکر و عقیدہ کے جس جس موڑ پر لغزش پا کی گنجائش نکل سکتی تھی۔ وہ موڑ اسلامی تاریخ کے سامنے آیا لیکن یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ اس کے باوجود اسلام کی اکملیت برقرار رہی ہے اور کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت سے الگ ہو کر کسی ڈھونگ کو وحدتِ امت کا مبنیٰ ٹھہرایا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کچھ مسخروں نے نبوت کا روپ ضرور دھارا اور رسالت کا دعویٰ بھی کیا مگر ان کی حیثیت کبھی ایسی نہیں ہوئی کہ سنجیدگی سے اس پر غور کیا جائے اور ان کو یہ درجہ دیا جائے کہ مسلمان ادھر متوجہ ہوں اور ان کی تردید کے لئے کمرِ ہمت باندھیں۔ کیونکہ ایک طرف تو اسلام کی دعوت اتنی واضح اتنی مکمل و مسلّمہ ہے اور دوسری دعوتوں سے اس

درجہ بے نیاز بنا دینے والی ہے کہ اس امر کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ کسی دوسری آواز پر کان دھرا جائے۔ دوسری طرف امت میں باخبری اور دینی فروق کی فراوانیاں اس ڈھنگ سے رہیں کہ ان دعاوی نے انہیں کبھی متاثر ہی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر چہ فرع سے لے کر اصول تک میں اختلاف رونما ہوا لیکن اس اصل کو کبھی محلِ بحث نہیں ٹھہرایا گیا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی نبوت کے دروازے کھل سکتے ہیں یا قصرِ نبوت میں مجرمانہ نقب زنی ممکن ہے۔ شیعہ سنی کا اختلاف کتنا بڑا اختلاف ہے، اس کے بارے میں بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی ایک چیز بھی ان میں مشترک نہیں، جو قرآن اہل السنّت کا ہے اور جن تعبیرات کے ساتھ اس کی تشریح کی جاتی ہے، شیعہ حضرات دیانتداری سے ان سے اختلاف رائے رکھتے ہیں، جن کتبِ حدیث پر مشرق سے لے کر مغرب تک فرق سنت وفقہ عمل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ وہ ان کے نزدیک حرفِ غلط سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں اور تو اور ان کے مجتہدین اور ہمارے آئمہ حدیث وفقہ میں اختلاف کی ایک خلیج حائل ہے جس کا پاٹنا آسان نہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ علاوہ دینیاتی اختلاف کے شیعہ سنی تاریخ تک مختلف فیہ ہے جن بزرگوں کو ہم اپنے اکابر سمجھتے ہیں اور جن کی سیرت واقوال سے اسلام کا نظریہ حیات مستنبط ہوتا ہے، خلافتِ راشدہ کا تصور نکھرتا ہے اور جن کی وساطت سے اسلام کی روشنی ہم تک پہنچتی ہے ان کے نزدیک یہی بزرگ غاصب و ظالم ہیں، معاذ اللہ، اس سے بڑھ کر اور کون سا اختلاف تصور میں آ سکتا ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ نبوت ہی کی ایک اصل ایسی ہے کہ جن پر دونوں کا پورا پورا اتفاق ہے، اور یہی اتفاق ہے جو اختلافات کی بوقلمونی اور شدت کے باوجود ان دونوں کو صدیوں سے ملائے ہوئے ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب تک کوئی گروہ اپنی عقیدت ومحبت کو آنحضرت

ﷺ کے ساتھ وابستہ رکھتا ہے اور اپنی طرف سے نئی عصبیتوں کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور نہ جدید نبوت پر الگ ملت کی عمارت ہی چنتا ہے اس وقت تک اسلامی اخوت اسے اپنے آغوش سے جدا نہیں کرتی اور ہزاروں اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی وہ ملت کا جزو بنا رہتا ہے۔ لیکن جہاں اس نے آنحضرت ﷺ کے دامنِ عقیدت سے علیحدگی اختیار کی اور اپنے لیے ایک الگ آستانہ محبت چنا، اسلام اس سے بیزار ہو گیا، کیونکہ تعلق کی اتنی سی کیفیت ہی تو اسلام ہے۔ یہی باریک فرق ہے جس کو اکثر لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھ پاتے کہ مرزائی کیوں اقلیت ہیں؟ جبکہ وہ وہی قرآن پڑھتے ہیں، انہی احادیث کو مانتے ہیں اور اسی فقہ پر عمل پیرا ہیں، اور ان میں اور ہم میں سوا ایک مسئلہ نبوت کے اور کوئی اختلاف ہی نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہی ایک مسئلہ تو ہم میں اور ان میں فارق ہے۔ اور اسی پر ملت کی اساس ہے اور اسی کی بناء پر دینی قومیں معرض وجود میں آتی ہیں۔ یہودی ایک قوم ہیں کیونکہ وہ انبیاء علیہم السلام کے ایک خاص سلسلے کو مانتے ہیں۔ عیسائی ایک قوم ہیں جو اس سلسلے کے علاوہ نبوت کی ایک کڑی کا اس پر اضافہ کرتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان، عیسائی یا یہودی قومیت کا جزو بننے کی کوشش کریں، عیسائی یہودیت کے دائرۂ ملت میں گھسنے کی سعی کریں۔ حالانکہ جہاں تک عقائد میں وحدت کا تعلق ہے ان سب میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور علاوہ نبوت کے اور کوئی بڑا اختلاف ان میں نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ کوئی عیسائی ایسا نہیں جو تورات کو نہ مانتا ہو اور کوئی مسلمان ایسا نہیں جو تورات کے علاوہ اناجیل کی صداقت اور سچائی کا قائل نہ ہو۔ اگر یہ درست ہے کہ نبوت ایک قوم پیدا کرتی ہے اور ایک معاشرے کی طرح ڈالتی ہے تو ہمیں تعجب ہے کہ مرزائی حضرات کیوں مصر ہیں کہ ان کی الگ قومیت نہ ہو۔ اور یہ خواہ مخواہ اسلامی معاشرے کا جز بنے رہیں۔ اگر

ان کو اسلامی عقائد سے دلچسپی ہے اور یہ توحید کے قائل ہیں، قرآن کو مانتے ہیں یا سنت کے دفاتر سے جزوی وابستگی قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ان میں علیحدہ قومیت میں کوئی تناقض نہیں کیونکہ علیحدہ قومیت رکھتے ہوئے بھی یہ اسی طرح ان سچائیوں کو تسلیم کرتے ہیں جس طرح کہ مسلمان یہودی عیسائی کتب کو تسلیم کرنے کے باجود اپنا الگ قومی وجود رکھتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ان لوگوں نے آخر یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ اگر انہیں اقلیت کی حیثیت سے رہنا پڑا تو ان حقوق سے لازماً محروم اور کنارہ کش ہی ہونا پڑے گا۔ مرزائی اقلیت کی صف میں آنے سے کیوں ڈرتے ہیں؟ کیا ان کے عقائد، تصورات اور جماعتی نظم ونسق کا ڈھنگ 'پہلے' سے ایسا نہیں کہ اس پر اقلیت کا گمان ہو؟

ہمارا روئے سخن دراصل حکومت کی طرف ہے۔ انہیں غور کرنا چاہئے کہ جب اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں کبھی ان وقتوں میں بھی اختلاف رائے نہیں ہوا جبکہ چمنِ اسلام میں اختلاف کی آندھیاں چلا کی ہیں تو آج ختمِ نبوت کی نصِ صریح پر قدغن کیوں ہو اور کیوں اس کی تشریح اور وضاحت کو دفعہ 144 کا ہدف قرار دیا جائے۔ ہم کھلے خزانے کہتے ہیں کہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت اور تعبیر پر پابندیاں برداشت نہیں کی جائیں گی۔ حکومت کو اچھی طرح سن رکھنا چاہئے کہ قرآن کے ایک ششہ اور نقطے پر بھی اسلامی حکومت میں کوئی قید گوارہ نہیں اور یہ بات ہونے والی نہیں کہ ظفر اللہ کی خوشنودی کی خاطر اللہ کے غیظ وغضب کو مول لیا جائے۔

مذہب وریاست کے موجودہ تقاضے اور نبوت

مرزائیت کے مسئلہ کو ہر گھر تک پہنچانے کے لئے ہم نے بحث وفکر کا ایسا

انداز اختیار کیا ہے کہ وہ لوگ جو اس فتنہ کا بدقسمتی سے شکار ہو گئے ہیں۔ مناظرانہ الجھنوں سے دماغ کو پریشان کئے بغیر ایسے دوٹوک سوالات کا سامنا کر سکیں جو رشد و ہدایت کی شاہراہوں پر انہیں ڈال دیں۔ اور آسانی سے انہیں یہ کہہ دیں کہ اس دجل وفریب کی داستان میں مذہب وفکر کی کون کون گمراہیاں پنہاں ہیں۔

لیکن جس مذہب کی پیدائش ہی مغالطوں کی آغوش میں ہوئی ہو، جو بڑھا اور پلا ہی غلط بیانیوں کے سہاروں پر ہو، اس کے مبلغوں سے یہ توقع رکھنا ہی بے کار ہے کہ یہ لوگ منطقی خطوط پر سلجھاؤ کے ساتھ کسی موضوع پر غور کر سکتے ہیں۔

بات بالکل سادہ تھی کہ نبوت کی غیرت وخودداری، اس کا مقام بلند، اس کی تعلیمات کا استقلال وتفرد اور اس کے پیغام وسیرت کی استواری کیا اسے اجازت دیتی ہے کہ حکومتِ باطلہ کی دہلیز پر جھکے، اس کی خوشامد کرے اس کے دائرہ اقتدار کو پھیلانے اور بڑھانے کی کوشش کرے اور دعائیں مانگے اور مریدوں کو تلقین کرے کہ ذلت وتحقیر کے اس جوئے کو عزت وافتخار کا طوقِ زریں سمجھ کر زیبِ گلو کر لیں اور اس پر اترائیں۔

جواب کے دو ہی پہلو ہو سکتے تھے کہ یا تو یہ ثابت کیا جاتا کہ انگریز کا سایہ واقعی آئیہ رحمت تھا اور اس کو بہر آئینہ قائم رہنا چاہئے تھا اور یا یہ کہ مرزا صاحب نے انگریز کی خوشامد نہیں کی اور پیغمبرانہ رکھ رکھاؤ پر اس سلسلہ میں آنچ نہیں آنے دی۔

ہم یہ سمجھے ہوئے تھے کہ سوال اتنا سیدھا، نکھرا ہوا اور صاف ہے کہ لغزشِ فکر اور غلط بحث کی کوئی بیہودگی، راہِ راست کی نشاندہی سے نہیں روکے گی اور ہر مرزائی استفسار کے اس موڑ پر بحیرو استعجاب سے اپنی گزشتہ غلطی پر متنبہ ہوگا اور یہ کہہ کر مرزا صاحب سے علیحدگی اختیار کر لے گا کہ کس عزت فروش اور گھٹیا مدعی کو مان رکھا تھا لیکن

مرزائی ذہن پھر آڑے آیا اور قبولیتِ حق کا یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

آئی تھی اب مزے پہ کہانی شباب کی
کس طرف کے مقام سے افسانہ چھٹ گیا

جواب کی ناکام کوششوں سے پہلے مدیر الفضل کو اس پر غور کر لینا چاہئے تھا کہ سوال کی نوعیت کیا ہے۔ سوال یہ نہیں تھا کہ تاریخ کے کسی دور میں حکومتِ وقت کے ساتھ تعاون جائز ہے یا ناجائز، بلکہ سوال یہ تھا کہ اس دور میں حکومت و اقتدار کے دائروں نے ایسا پھیلاؤ اختیار کر لیا ہے کہ وہ زندگی کے ہر گوشہ پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر انداز ہے؟ سیاسیات نے سٹیٹ اور ریاست کو اس انداز سے پیش فرمایا ہے کہ اس کے اپنے ایمانیات ہیں، اپنے اخلاق اور معاشرتی و معاشی نقشے ہیں، لہذا یہ اس فطرت اور مزاج کے ساتھ، مذہب کی جامعیت، اس کے پھیلاؤ اور وسعت پر پوری قوت سے حملہ آور ہے۔ لہٰذا اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ دونوں ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو چل سکیں۔ اس لئے یا تو اس دور میں یہ دنیوی ریاستیں چل سکتی ہیں اور یا پھر دینی نقطۂ نظر کی تائید کی جا سکتی ہے۔ بیک وقت دونوں کا ساتھ دینا منافقت ہے۔ کیونکہ دونوں نظام اس ڈھنگ کے ہیں کہ پوری پوری اطاعت کے خواہاں ہیں۔ وہ دور گزر چکا ہے جب ریاست نے پاؤں نہیں پھیلائے تھے اور جب یہ ممکن تھا کہ قیصر اور خدا کی حکومت میں تفریق و امتیاز کے تصور نے تکمیل و جامعیت کی اتنی منزلیں طے کر لیں کہ فکر و عقیدہ کے حلقوں سے لے کر عمل و کردار کی تمام وسعتوں تک اس کا عمل دخل ہے اور دوسری طرف ریاست کے تقاضے اس طرح کے ہو رہے ہیں کہ زندگی کو یکسر مادی سانچوں میں ڈھالا جائے اور کوئی گوشہ اس کا ایسا نہ رہنے پائے جو اس کی دسترس سے باہر ہو۔ یعنی ریاست اب اس پر قانع نہیں ہے کہ صرف نظم و نسق کی زمام تھامے رہے

اور رعایا کو کھلی چھٹی دے دے کہ جس تہذیب و عقیدہ کو وہ چاہے اپنا لے کیونکہ آخر میں یہ حکمتِ عملی اور یہ ڈھیل ریاست کیلئے مضر ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ انگریز کی گزشتہ حکومت ریاست کے اسی مفہوم کی مظہر و حامل تھی۔ یہی سبب ہے کہ اس نے ہماری تعلیم کے رخنوں کو بدلا، تہذیب و ثقافت کی سمتوں میں تغیر و تبدل پیدا کیا اور اخلاق و عوائد کی پرانی قدروں کے بجائے عریانی و فحاشی کی نئی نئی قدروں کے لئے آہستہ آہستہ دلوں اور دماغوں کو ہموار کرنا ضروری سمجھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں ایک نبی کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایسی ریاست اور حکومت کو اپنا کھلا ہوا دشمن سمجھے۔ اس کے خلاف صف آرا ہو، اور ہر ہر مورچے پر اسے شکست دینے کی کوشش کرے۔

اس وضاحت سے کہ مذہب وریاست کی موجودہ صورت گزشتہ صورت سے مختلف ہے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے موقف سے متعلق غلط فہمی دور ہو جاتی ہے کیونکہ یہ وہ دور تھا جب مذہب کے معنی چند بچے تلے مفروضات کی اشاعت کے تھے اور ریاست کا تقاضا بھی اس سے زیادہ نہ تھا کہ وہ نظم و اہتمام ملکی کے چند خانوں پر قابض رہے، نہ مذہب نے اس وقت تکمیل کے یہ مرحلے طے کئے تھے اور نہ ریاست اتنا بڑھ پائی تھی کہ دونوں باہم متصادم ہوں اس لئے یہ کہنا کہ چونکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے قیصر کے حقوق اور خدا میں تفریق روا رکھی ہے یا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعون کی حکومت سے تعاون کیا ہے لہٰذا موجودہ دنیوی حکومتوں سے تعاون جائز ہے۔ محض قیاس مع الفارق ہے۔

اس دور کے پیغمبر سے سیاسی خودداری و غیرت کی جو توقعات ہیں وہ اسلام کی جامعیت اور ریاست کے موجودہ تصور و خواہشات کے پیش نظر بجا طور پر پیدا

ہوتی ہیں کہ وہ اس عہد کے سیاسی فتنوں کو بالخصوص مٹائے گا اور صلیب وسور کی تہذیب کے مخالف محاذ پر جرأت وجسارت سے لڑے گا نہ یہ کہ وہ ان کی تعریف کرے گا۔ جہاد کو منسوخ ٹھہرائے گا، اپنے کو ان کا خود کاشتہ پودا قرار دے گا اور اس پر فخر کرے گا کہ ''میں نے صدہا کتابیں جہاد کے مخالف تحریر کر کے عرب، مصر اور بلادِ شام اور افغانستان میں گورنمنٹ کی تائید میں شائع کی ہیں۔ (تبلیغ رسالت جلد چہارم حاشیہ صفحہ 46) یا یہ کہے گا کہ انگریز میری تلوار ہے اور میں عراق، عرب اور شام ہر جگہ اس کی چمک دیکھنا چاہتا ہوں۔ (اخبار الفضل جلد 6، 17 دسمبر 1918ء)

الفضل کا مدیر بتائے کہ یہ تعاون علی البر ہے یا ایسی گھٹیا خوشامد ہے کہ کوئی خود دار شخص اس کا ارتکاب نہیں کر سکتا؟ ریاست کے موجودہ تصور کو ذہن میں رکھئے پھر اس سوال پر دوبارہ غور کیجئے انگریزی حکومت کے معاندانہ کارناموں پر بھی نظر دوڑایئے اور اسلامی نظام کے مزاج کو بھی پہچانئے اور بتایئے کہ کیا ہم ایسے ہی خوشامدی اور کتب فروش مدعیٔ نبوت کے منتظر تھے یا کیا یہی نبوت ہے جس کا مقام اس سے کہیں اونچا ہے اور اس سے جو توقع قائم کی جاسکتی تھی وہ منسوخیٔ جہاد کی نہیں تھی بلکہ قیامِ جہاد کی تھی۔

رہا یہ مسئلہ کہ کن کن بزرگوں نے فتنے کی اس اہمیت کو نہیں پہچانا اور مرزا صاحب کی طرح انگریز کو غنیمت جانا تو یہ بلا شبہ ان کی غلطی تھی اور اس میں کسی کی تخصیص نہیں۔ ان میں کوئی بزرگ بھی اگر نبوت کا دعویٰ کرتے تو ہم ان کی بھی یقیناً بڑی سختی سے تردید کرتے اور اس کو کھلے بندوں بہت بڑی گمراہی ٹھہراتے۔

نبوت و رسالت

جھوٹ اور سچ کا فرق

- ختمِ نبوت کے معنی
- رومی وابن العربی کو سمجھنے کے لئے
- نبوت و رسالت کا عام فہم معیار
- پیغمبر مناظر نہیں حکیم ہوتا ہے
- اللہ کا معیارِ انتخاب
- کیا یہ پیغمبر ہے؟
- دو مختلف دعوے (تجدید..... نبوت)
- مجازی نبی اور ظلی نبی
- نبوت اور ذوقِ شعری
- جھوٹا نبی اور سچا نبی
  دونوں میں فرق کی نوعیت
- سخن فہمی بالا سخن

اور یہ رؤیا

آیت تقول کی صحیح تفسیر ○ پیشین گوئی کا پنجرہ

ختم نبوت کے کیا معنی ہیں؟

آج کل الفضل میں نبوت کے جاری رہنے کے متعلق بحث ہو رہی ہے اور رومی و ابن العربی کی عبارت و اشعار کو ثبوت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ انہیں یہ کون سمجھائے کہ ہر موضوعِ بحث کا ایک وقت ہوتا ہے۔ تیرہ چودہ صدیاں ہوتی ہیں اسلام اس سے فارغ ہو چکا۔ اس نے ایسا مکمل دین پیش کیا، اس طرح زندگی کی گتھیوں کو سلجھایا اور اس طرح ایک نمونہ کا معاشرہ پیش کیا کہ خود دوسرے بول اٹھے کہ مذہب کے بارے میں اس سے اگلا قدم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہاں فکر کی پرواز ختم ہو جاتی ہے اور خیال کی اڑانیں منتہی۔

آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیمات و عمل کے ذریعے قصرِ نبوت کے در و دیوار کو اس انداز سے پیش کیا کہ ایک ایک اینٹ تکمیل و جامعیت پر شاہدِ عدل قرار پائی۔ کہنے کی بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ ختمِ نبوت کا مسئلہ ایسا نہیں کہ اس کا تعلق چند آیات اور احادیث ہی سے ہو بلکہ یہ تو ایسی حقیقت ہے کہ دین پر سرسری نظر ڈالنے سے خود بخود ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ یعنی روئے زیبا کے لئے نبوت کی کیا حاجت ہے وہ تو نظروں میں بچ جانے کا نام ہے اور بس! اسی طرح زیبائی و خوبی کا اتنا مکمل ہونا، اتنا جامع ہونا کہ کوئی پہلو اعتراض کا نہ رہے، اس کے لئے الگ تصریح کی ضرورت نہیں چنانچہ جو شخص بھی اسلام کے اس نقشے کو دیکھے گا جس کو آنحضرت ﷺ نے پیش کیا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ آخری مرقع ہے حضرتِ مصور کا، خلاق اکبر کا۔ جھوٹے نبیوں کو تو چھوڑیئے مسیلمہ سے لے کر مرزا صاحب تک کسی نے کام کی بات ہی نہیں کی۔ ان

کے افکار محض پوچ، دعویٰ سراسر باطل اور سیرت بالکل ہیچ، ان کے آنے سے لٹریچر میں ایک حرفِ جمیل کا بھی اضافہ تو نہیں ہوا۔ کردار واخلاق کا کوئی پاکیزہ نمونہ نہیں ابھرا اور فکر و تصور کی دنیا میں تو بالکل ہلچل پیدا نہیں ہوئی۔ حکماء و سیاسیین میں ان بڑے بڑے لوگوں کو لیجئے جنہوں نے گو نبوت کے جھوٹے دعوے نہیں کئے، وفاتِ مسیح کی رٹ نہیں لگائی، چندہ وصول نہیں کیا اور بیعت کا ڈھونگ نہیں رچایا۔ تاہم ان کے فلسفہ اور خیالات سے اس کارخانہ آب وگل میں عظیم تغیر رونما ہوا ہے۔

پھر اس تغیر وانقلاب کا مقابلہ کیجئے اس انقلاب سے جو ایک ''اُمی'' نے پیدا کیا اور سوچ سمجھ کر بتایئے کہ اسلام نے خیر و برکت کی جو دولت بانٹی، اس کی کوئی مثال اس میں ملتی ہے۔ اس نے ایمان واذعان کی جو شمعیں روشن کیں ان کا کہیں وجود ہے۔ اسلام نے جتنا پاکیزہ معاشرہ دنیا والوں کے سامنے پیش کیا آج علم وحکمت کی فراوانیوں کے باوصف اس کی نظیر ہے؟ توحید کے بعد عرفانِ الٰہی کی کوئی اور شکل لوگوں نے دیکھی، نمازوں سے زیادہ بہتر عبودیت و بندگی کے نمونے نظر آئے؟ اخلاق کی وہ پاکیزہ دنیا میں پھر پلٹ کر آسکی؟ اور سیاسیات میں عہد صدیقیؓ و فاروقیؓ کی برکات کا اعادہ ہوسکا؟ تاریخ کے ایک ایک ورق کا یہ جواب ہوگا کہ نہیں، یہی ختم نبوت ہے اور یہی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی صحیح تفسیر ہے۔

رومی وابن العربی کو سمجھنے کے لئے

الفضل کے صفحات میں رومی وابن العربی کا نام بار بار پڑھ کر بڑا تاسف ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمیں دونوں کے افکار سے کہیں کہیں اختلاف ہے۔ بالخصوص وحدت الوجود کے مسئلہ میں لیکن ان کی جلالتِ قدر اور علمی بلند پائیگی کا کون

انکار کرسکتا ہے۔ انہوں نے توحید و نبوت کے مسائل پر جس اسلوب سے جدت طرازی فرمائی ہے اس کے فہم کیلئے بہرآئینہ گہرے علم اور صحبتِ صالح کی ضرورت ہے کیونکہ ان بزرگوں نے اپنے مصنفات میں جن جن رموز و اسرار سے متعلق لکھا ہے اس کا تعلق یا تو مقامات و احوال سے ہے اور یا مصطلحات علمیہ سے اور دونوں کا سمجھنا علی الترتیب عمل و علم ہی سے لگاؤ رکھتا ہے۔ عامی کا اس کوچہ میں قطعی گذر نہیں اور ہمارے قادیانی دوستوں کو خوب معلوم ہے کہ ان کے طائفہ میں اس ذوق کا ایک بھی آدمی نہیں۔ اس لئے ان مسائل پر اظہارِ خیال کر کے ان کا بھٹک جانا بالکل قدرتی ہے۔

صوفیا کے اقوال پیش کرنے سے پہلے یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہے کہ ان لوگوں کی اپنی اصطلاحیں ہیں جو دیگر علماء وفقہا سے الگ ہیں۔ اس لئے یہ جب نبوت یا احوالِ نبوت پر گفتگو کرتے ہیں تو اس سے مراد وہی ثبوت ہونا چاہیئے جس کا ان کی کتابوں میں تذکرہ ہے اور جو ان کی اصطلاح ہے۔ وہ نبوت نہیں جو قرآن و حدیث میں آئی ہے۔ ولا مناحة فی الا صطلاح (اصطلاحات کے وضع کرنے میں کوئی جھگڑا نہیں)۔

وہ نبوت جس کے دروازے بند ہیں وہ، وہ ہے جس میں عقائد و تصورات کے مخصوص مجموعے پر یا کردار و سیرت کی متعین تشکیل پر یا دین کی ایک ہی تعبیر اور ترجمانی پر لوگوں کو اکٹھا ہونے کی دعوت دی جائے۔ حالانکہ اس میں لغۃً یا دوسرے وجوہ تاویل کے اعتبار سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ اس نبوت کا ہونا اب ناممکن ہے جو ہمارے لئے مدار کفر و ایمان بنے یعنی جس کا ماننا تقاضائے ایمان ٹھہرے اور جس کا انکار کھلا ہوا کفر قرار پائے۔ ایسی نبوت اب نہیں ہوسکتی جو ہماری صفوں کو دو

حصوں میں بانٹ دے۔ ماننے والے مومن کہلائیں اور نہ ماننے والے کافر۔ کیونکہ معیار اور کسوٹی کے پیش نظر یہ شرف اسلام کے ساتھ خاص ہو چکا۔ اس کے صاف صاف یہ معنی ہیں کہ اگر آپ آنحضرتؐ کی رسالت کے قائل ہیں اور دس کروڑ عالموں اور صوفیوں کو نہیں مانتے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں آپ کا ایمان بلاشبہ مکمل ہے یعنی ایک محمد رسول اللہ ﷺ کے مان لینے سے آپ نے اس فکر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہائی پائی کہ اب کسی اور آستانِ عقیدت کا کھوج لگایا جائے۔

انسانی بہبود کے لئے جو کچھ کہنا تھا اسلام کہہ چکا۔ سیرت وعمل کا بہتر سے بہتر نمونہ آنحضرت ﷺ پیش فرما چکے اور بدرجہ آخر تعبیر و ترجمانی کے اصول بھی علماء منضبط کر چکے جن کی روشنی میں اختلافی مسائل میں جچی تلی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ ان حالات میں نئی نبوت کیلئے کیا کام اور مصرف باقی رہ جاتا ہے۔ خوب غور کر کے بتایئے۔ بات مناظرہ کی نہیں غور وفکر کی ہے۔ رہیں ان بزرگوں کی تصریحات تو ان کے ہاں جو کچھ جاری ہے۔ وہ فکر و نظر اور قلب و بصر کی فتوحات کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ نبوت ان کے ہاں ولایت ہی کا ایک پہلو ہے کیونکہ ولایت کا مفہوم ان کے نزدیک نبوت سے زیادہ عموم لئے ہوتا ہے یہ اس نبوت سے قطعی بحث نہیں کرتے جو کفر و ایمان کی کسوٹی بنتی ہے۔ جو مخصوص گروہ پیدا کرتی ہے۔ یا متعین معاشرہ تعمیر کرتی ہے۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھو کہ یہ نظر جو کچھ دیکھ سکتی ہے اس کے امکانات ہمیشہ قائم رہیں گے۔ یہ دل و دماغ جتنا اونچا اڑ سکتا ہے، اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ غور وفکر اور مراقبہ ومشاہدہ کے دروازے دائماً کھلے رہیں گے۔ لیکن جو چیز بند ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد اللہ تعالیٰ اب کسی شخص کو مدار کفر و ایمان بنا کر نہیں بھیجے گا۔

نبوت و رسالت کا عام فہم معیار

انبیاء علیہم السلام کے آنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وقت کے کچھ سوالات ہیں جو ابھر رہے ہیں کچھ تقاضے ہیں جن کا زندگی کا چوکھٹا بنانے میں حصہ ہے' کچھ خیالات و افکار ہیں جو ذہنوں کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام آکر ان سوالات کے مقابلہ میں ایک متعین موقف اختیار کرتے ہیں ان تقاضوں کے اعتبار سے اسلامی برتاؤ کی وضاحت کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ زندگی کے ان نظریات میں جو سوالات پھیل رہے ہیں اور پھیلائے جا رہے ہیں حق و صداقت کی مقدار کتنی ہے' وہ سچائیوں کو قبول کرتے ہیں اور ان سچائیوں میں ملے ہوئے جھوٹ کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ ان سے پہلے پوری زندگی کا ایک نقشہ ہوتا ہے جس پر لوگ عمل پیرا ہوتے ہیں اور ان کا فرض منصبی ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس پورے نقشہ کا جائزہ لیں' نقشہ کی ایک ایک تفصیل کو دیکھیں اور پھر اصلاح و ہدایت کا جو پروگرام پیش کریں اس میں پوری زندگی کا پھیلاؤ ہو' وہ بتائیں کہ معتقدات میں کیا کیا خامیاں ہیں اور عمل میں کس کس انداز کی کوتاہیاں ہیں۔

یعنی اس وقت کی پوری تمدنی و معاشی زندگی پر حکیمانہ انداز سے نظر ڈالیں اور اس وقت کے تمام مضمرات و امکانات کو سامنے رکھ کر جس وقت و عصر کے وہ پیغمبر ہیں ایک جچا تلا لائحہ عمل لوگوں کے سامنے پیش کریں...... اس میں وقت کے وہ تمام سوالات سمٹ کر اس طرح آجائیں کہ بحث و نظر کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہے۔

یہ واضح رہے کہ نبوت کے جمال جہاں آراء کی یہ صرف ایک جھلک ہے یا یوں کہئے کہ صرف ایک پہلو ہے نظروفکر کا' ورنہ اس باب میں اور بھی کئی چیزیں کہنے کی ہیں جو آئندہ پیش آئندہ مناسبتوں کے مدنظر انشاء اللہ پیش کی جائیں گی۔ جب یہ اصول طے ہو گیا کہ پیغمبر کی ژرف نگاہی وقت کے تقاضوں کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتی اور باریک سے باریک مکنونات کو بھی ٹٹول لیتی ہے تو اب اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی الجھاؤ نہیں رہے گا کہ اس کی بعثت و تبلیغ سے خود زمانہ یا عصر کس حد تک متاثر ہوتا ہے اور یہ زمانہ یا عصر کیا شے ہے؟ آیئے اس سوال پر بھی لگے ہاتھوں غور کرلیں۔ زمانہ تعبیر ہے ان قوتوں سے ان عوامل سے اور خیالات و افکار کی ان موجوں سے جو زندگی کی زنجیر بنانے میں حصہ لیتی ہیں اس قدر جاننے کے بعد اب نبوت کے ردفعل کو معلوم کرلینا دشوار نہیں رہے گا کہ اس کی تعلیمات اس نہج کی ہونی چاہئیں کہ ان سے وقت کی تمام قوتیں لرزہ براندام ہوں۔ تمام عوامل خائف ہوں اور تصورات و نظریات کے تمام حلقے نئی شکل میں ڈھلنے کیلئے آمادہ' غرض یہ نہیں کہ ان میں ہر ایک کو اپنی زندگی میں کامیابی بھی نصیب ہو اور وہ اس حد تک کامران و خوش بخت بھی ہو کہ بہر آئینہ ایک نمونے کا معاشرہ قائم کرکے دنیا سے رخصت ہو بلکہ صرف یہ ہے کہ ان کے پیغام اور دعوت میں انقلاب آفرینی اور تغیروتعمیر کی پوری صلاحیتیں موجود ہوں۔

اس سلسلے کی ایک اہم کڑی اور ہے اس کو سمجھ لینے کے بعد نتائج خودبخود آپ کے ذہن میں آنا شروع ہو جائیں گے اور وہ ہے حکومت' ریاست یا ہیئت حاکمہ' یہ ہے زمانہ کا اولین مفہوم یا نبوت کا حقیقی مخاطب' یا حریف' اس

کی یہ کوشش رہتی ہے کہ خیالات و افکار اور رسم و رواج کے سانچے اس طرح ڈھلیں کہ جس سے اس کے اقتدار کو ٹھیس نہ لگے لہٰذا نبوت کی زد میں سب سے پہلے وقت کی یہی حکمران قوتیں آتی ہیں سب سے پہلے انہی ایوانوں میں ایک جھٹکا اور زلزلہ محسوس ہوتا ہے یعنی عوام الناس سے بھی قبل نمرود دعوت ابراہیمی کے دور رس نتائج پر نظر ڈالتا ہے اور بنی اسرائیل اور قبطیوں سے بھی پیشتر خود فرعون اس کا دھڑکا دل میں پاتا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد مسئلہ بڑی حد تک نکھر گیا ہے۔ اب یہ بتایئے کہ مرزا صاحب کے ادعائے نبوت سے وقت کے کن تقاضوں کا جواب ملا اور وقت سے کون کون سے سوال حل ہوئے اور انگریزی حکومت ان کی دعوت سے کس حد تک متاثر ہوئی گورنمنٹ ہاؤس میں کیا غلغلہ ہوا اور بکنگھم پیلس میں کہاں کہاں شگافوں نے منہ کھولا' جواب میں اتنی مایوسی اور قنوط ہے کہ اسے جواب سے تعبیر کرنا ہی غلط ہے۔ مرزا صاحب کے سارے لٹریچر کو کھنگال ڈالنے کے بعد بھی دعوت یا پیغام کے قسم کی کوئی چیز نہیں ملتی' وقت کے وہ سوالات جن پر ان کے معاصرین نے نہایت خوبی اور بلاغت سے بحثیں کی ہیں ان کی مصنفات کے صفحات ان سے بالکل تہی ہیں۔ ان کی کتابوں سے یہ بالکل مترشح نہیں ہو پاتا کہ یہ کوئی سلجھا ہوا پروگرام لائے ہیں یا ان کی کوئی دعوت ہے یا موجودہ عصر کے تہذیبی و ثقافتی رجحانات کے خلاف یہ اپنے مستقل بالذات خیالات رکھتے ہیں یا اسلام ہی کی کوئی ایسی تعبیر پیش کرنا چاہتے ہیں جو وقت کے شکوک و شبہات کا ازالہ کر سکے اور اسلامی موقف کو موجودہ نظریات کی روشنی میں زیادہ وضاحت سے بیان کر سکے۔

ان میں سے کسی چیز کو بھی مرزا صاحب نے چھوا تک نہیں۔ تمام تصنیفات گھٹیا قسم کی مناظرانہ بحثوں سے معمور ہیں' جن میں نہ تنقید کا کوئی اصول مدنظر ہے؟ نہ صحت مند طرز نگارش کی کوئی جھلک .... اور حکومت کے سامنے تو انہوں نے یوں پوٹاٹیک دیا ہے جس پر آج پرانا یونینیسٹ بھی شرما جائے۔ اب اگر یہ نبوت ہے تو پھر ہمیں بتادیجئے کہ ڈھونگ کسے کہتے ہیں؟

پیغمبر مناظر نہیں حکیم ہوتا ہے

جس طرح حاذق طبیب کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ مریض کی ایک ایک بیماری کو پہچانتا ہو اور پھر اسے یہ بھی معلوم ہو کہ ان بیماریوں میں زیادہ اہم اور توجہ طلب بیماری کون ہے؟ ٹھیک اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا ہاتھ قوم کی نبض پر ہوتا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ جسم و روح پر کن کن امراض کا حملہ ہے پھر انہیں اس شے کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کن عوارض کا علاج پہلے ہونا چاہئے اور کون عوارض بعد میں توجہ طلب رہیں گے۔ پھر جس طرح اصلی شے تشخیص ہی نہیں اور بیماریوں کے مدارج مختلفہ کی پہچان ہی نہیں بلکہ معالجہ ہے یعنی اچھا اور کامیاب طبیب وہی نہیں جو ایک نظر میں عوارض کی تہہ تک پہنچ جائے بلکہ وہ ہے جو اس انداز سے مریض کا علاج کرے جو واقعی اس کے لئے صحت بخش اور مفید ہو' یہیں سے ایک طبیب اور حکیم کی راہیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ طبیب صرف علائم ظاہرہ کو جانتا ہے ادویہ اور ان کے خواص کی معرفت سے بہرہ مند ہے۔ اس سے زیادہ نہیں اور حکیم کی نظر مریض کی حالت نفسی پر بھی رہتی ہے اسے اس کا بھی علم ہے کہ معالجہ کے مختلف و متعدد طرق میں سے کون طریق ذہنی و نفسیاتی اعتبار سے زیادہ مفید رہے گا کیونکہ ایک مریض

طبیب سے جو بنیادی توقع رکھتا ہے وہ یہی ہوتی ہے کہ جسم سے پہلے اس کی روح کو چارہ سازی کی افادیت کا یقین ہو جائے اور بیماری نے پے در پے حملوں سے جن صلاحیتوں کو ختم کر دیا ہے وہ پھر لوٹ آئیں علاج و معالجہ اس کے بعد کی شے ہے۔

اسی طرح ایک پیغمبر کی کامیابی یہی نہیں کہ وہ قومی جسم کے تمام عوارض سے آگاہ ہو بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کا طریق علاج حکیمانہ ہو' اس میں یہ رعائت رکھی گئی ہو کہ نسخہ ایسا تجویز ہو کہ جس سے روح کی بالیدگی کا اہتمام سب سے پہلے ہو' علاج اس ڈھنگ سے ہو کہ ذہن کی تازگی اور قلب کی بشاشت سب سے پہلے پلٹ کر آئے۔ نبوت کا یہ عام پیمانہ ہے جس کی تعیین کے لئے بہت بڑے علم کی ضرورت نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو اس کے حدود سے تھوڑی سی واقفیت بھی رکھتا ہے اور اس کے مذاق سے آشنا ہے اس کو جانے گا۔

آیئے اس صدی کے قومی امراض کا جائزہ لیں اور پھر دیکھیں کہ بحیثیت مریض کے ہماری توقعات ایک پیغمبر سے کیا ہو سکتی ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا عارضہ جس سے ہم دوچار ہوئے اور اب تک جس کے اثرات سے ذہن محفوظ نہیں ہیں وہ مرعوبیت کا عارضہ ہے۔ انگریزی عہد اقتدار میں احساس کمتری کا ہم اس شدت سے شکار ہوئے کہ ہماری ہر بات سے ایک طرح کی بے چینی ٹپکنے لگی۔ سیاسیات سے لے کر مذہب تک میں معذرت طلبی کا عنصر غالب رہا۔ دین سے متعلق ہماری بڑی سے بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح مغربی خیالات و تصورات سے اس کی ہم آہنگی ثابت ہو جائے اور ہم دوسرے سے ببانگ دہل یہ کہہ سکیں کہ ہمارا مذہب بحمد اللہ عقل و فکر کی جدید کسوٹیوں پر پورا

اترتا ہے۔ حالانکہ یہ نقطہ نظر مذہب کی موت تھا۔ کیونکہ یہ تو اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب اس کی حیثیت ایجابی اور جارحانہ ہو جب یہ زمانہ کے اغلاط پر اہل زمانہ کو ٹوکے' نظری و عملی گمراہیوں پر ڈانٹے اور خود اعتدال و عقل میں سمویا ہوا زندگی کا ایک ڈھب پیش کرے ورنہ علم کلام کی لیپاپوتی اور نئے نئے تصورات حیات کی تائید و نصرت اس کی گرتی ہوئی دیواروں کو نہیں بچا سکتی۔ مذہب جب تک آگے آگے رہتا ہے زندہ رہتا ہے اور جہاں اس کی حیثیت ثانوی ہوئی ختم ہو گیا۔ یہ قائد بن کر دنیا میں آتا ہے اور اپنی قیادت سے عمر بھر دستبردار نہیں ہوتا۔ اس کی غیرت و خودداری تتبع و اطاعت کی ذلتیں کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

اس معذرت طلبی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی تصور صرف "مناظرہ" بن کر رہ جاتا ہے یعنی اس میں وہ بھاری بھرکم پن طبعی سنجیدگی' ایجابیت اور وقار نہیں رہتا جو اس کی وہ خصوصیات ہیں جو کبھی جدا نہیں ہوتیں بلکہ یہ صرف اکھاڑے کی ایک شئی ہو کے رہ جاتا ہے اور ظاہر ہے مذہبی اٹھا پٹخ کا نام ہرگز نہیں ہے یہ ایک پیغام سے تعبیر ہے جو حد درجہ سنجیدہ ہے۔ ایک دعوت کا نام ہے جس میں ایجاب و اثبات کے کامیاب پہلو نمایاں ہیں۔ مذہب زندگی ہے' تہمت زندگی نہیں' لہٰذا ہمیں ایک مدعی نبوت سے جو توقع ہو سکتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ مناظرہ بازی اور سستی کتب فروشی سے بالاتر ہو کر مذہب کے تصور کو اس دلکشی سے پیش کرے' ایسی ایجابیت کے انداز میں دہرائے کہ مغربی علوم کی آمد آمد سے جو ایک طرح کی مرعوبیت ذہنوں پر طاری ہو گئی تھی وہ دور ہو جائے۔ اسلام کی تعبیر ایسے ڈھب سے لوگوں کے سامنے آئے جس میں مناظرانہ چھچھورپن نہ

ہو' بحث و جدل کی سطحیت نہ ہو' ایک پہلوان کی اکھاڑ پچھاڑ نہ ہو بلکہ ایک حکیم کی سوجھ بوجھ ہو' ایک فلسفی کی متانت ہو اور پاکیزہ سیرت ہو' ایسا سلجھا ہوا عمل ہو اور عملی زندگی کا ایسا پیارا نمونہ ہو کہ جس کی ایک ایک ادا پر اس وقت کے نظریات حیات خود بخود نثار ہوں' ہمیں مناظرہ سے نفرت ہے۔ اس سے زیادہ غیر معقول' غیردینی اور غیر نفسیاتی حربہ اور کوئی نہیں ہو سکتا' اس کا مذاق عام اس وقت ہوتا ہے جب کسی قوم سے سیرت کی محکمی اور دلائل کی شوکت رخصت ہو جاتی ہے جب زندگی و عمل اور نمونہ و اسوہ کی جاذبیتیں جواب دے جاتی ہیں' یہ ایک طرح کی مذہبی سوفسطائیت ہے جس کے بطن سے صالح اور عمدہ منطق کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ اس سے ظہور پذیر ہونے والی چیزیں کیا ہیں؟ جھگڑا' مناقشہ اور بدذوقی یا ایک طرح کا مراق' اب یہ فرمائیے مرزا صاحب کا سب سے بڑا تحفہ کیا ہے جو انہوں نے ہمیں مرحمت فرمایا یہی "مناظرہ" یعنی پوری قوم لال کتاب ہاتھ میں لئے ایک دنیا سے دست و گریباں ہے' حوالہ سے حوالہ اور ورق سے ورق ٹکرا رہا ہے' انبیاء علیہم السلام کا ورثہ یقیناً یہ حقیر چیزیں نہیں ہو سکتیں وہ جو کچھ چھوڑ کر جاتے ہیں وہ ذہنوں کی بالیدگی ہوتی ہے۔ فکر کا سلجھاؤ ہوتا ہے اور عمل کی پاکیزگی' مناظرہ' معذرت طلبی اور بحث و جدل کی قیل و قال سے ان کی تبلیغی سطح کہیں بلند ہوتی ہے۔

اللہ کا معیار انتخاب

انبیاء علیہم السلام کو چونکہ دنیا میں اس لئے بھیجا جاتا ہے تاکہ اللہ کے پیغام کو اس کے ان بندوں تک پہنچا دیں جو فکر و عمل کی گمراہیوں میں مبتلا ہیں۔ اس لئے انہیں قول و عمل کی وہ تمام جاذبیتیں عطا کی جاتی ہیں جو نفس دعوت کو

مقبول و محبوب ٹھہرانے کیلئے ضروری ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا مبعوث ہونا اللہ کے انتخاب سے ہے۔ لہٰذا جب وہ کسی بندے کو چنے گا تو اس کا انتخاب کتنا صحیح اور کس درجہ بلند ہو گا' اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لی جائے' انہیں روح و معنی کی تمام خوبیوں سے نوازا گیا' قلب و دماغ کی ہر ہر صلاحیت سے بہرہ مند کیا گیا' سیرت و عمل کے ہر ہر ظہور سے مشرف فرمایا گیا اور اسوہ و کردار کی ایسی ایسی خصوصیتیں بخشی گئیں جن سے ان کی محبوبیت و دلنوازی میں اور اضافہ ہو گیا۔ انبیاء علیہم السلام کو محبوبیت و دلنوازی کی ان تمام اداؤں سے اس مقدار کے ساتھ اس لئے آراستہ کر کے بھیجا جاتا ہے تاکہ کشش و جذب کی یہ کیفیتیں عوام کو ان کا گرویدہ بنا دیں اور یہ اللہ کے پیغام کو زیادہ کامیابی کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں اتار دیں۔
یوں تو نبوت کے بے شمار فیوض اور ظہورات ہیں لیکن ایک فیض یا ظہور ایسا ہے جس کا نبوت سے بڑا قریبی تعلق ہے اور وہ ہے حسن بیان' گفتگو اور اظہار مدعا کا صحیح مذاق' تحریر و ادب کی سحر طراز چاشنی یا فصاحت و بلاغت کی معجزانہ صلاحیتیں' فصاحتو بلاغت کی تعریف میں اہل فن نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ آپ اختصار کے ساتھ یوں سمجھ لیجئے کہ حسین ترین معنی اگر حسین ترجامہ لفظی اختیار کر لیتا ہے تو اس کا نام فصاحت ہے اور انبیاء علیہم السلام کے درجہ فصاحت پر یوں غور فرمائیے کہ انہیں جو کلام دیا جاتا ہے' اس میں براہ راست اس خلاق حسن و خوبی کی بخششوں کو دخل ہے جس کی ہلکی سی توجہ سے یہ سارا گلستان وجود مہک رہا ہے۔ عہد نامہ جدید و قدیم بڑی حد تک محرف ہے مگر آج بھی سیدنا داؤد علیہ السلام کا زبور پڑھو' سیدنا سلیمان علیہ السلام کے امثال سنو'

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے مواعظ پر غور کرو جو بائبل میں کئی جگہ مذکور ہیں۔ اناجیل کی زبان اور تیور دیکھو' تمہیں اندازہ ہو گا کہ انبیاء علیہم السلام کے بیان میں کس درجہ بلاغت' کتنی شوکت و حشمت اور کس درجہ رکھ رکھاؤ ہوتا ہے اور سب سے آخر میں پھر قرآن کو دیکھو جس میں نظم کی سی موزونیت' شعر کا سا ترنم اور نثر کا سا پھیلاؤ اور وسعتیں ہیں جو بیک وقت نظم و نثر کی تمام خوبیوں کا حامل ہے' ایک ایک لفظ نہیں' ایک ایک شوشہ اور نقطہ کتنا تیکھا اور کتنا شوخ ہے۔ انداز بیان کتنا مدلل' کتنا شیریں اور پراز معنی ہے' سینکڑوں تفسیریں لکھی گئیں اور ہر تفسیر میں اس کے حسن و جمال اور معنی و مغز کو اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی لیکن نہ تو گہرہائے معانی ختم ہوئے اور نہ اس کے حسن و جمال کی داستانیں ہی کم ہوئیں اور خدا ہی جانتا ہے ابھی کتنے رازی' کتنے زمخشری' کتنے ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہم اللہ علیہ پیدا ہوں گے اور قرآن کے حکم و اسرار کے کیا کیا یہ انسان کے ذوق ادب کی تسکین کا سامان بہم پہنچائیں گے۔ احادیث پر اس نقطہ نظر سے غور کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کا یہ مجموعہ کتنے نوادر ادب اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔

ان کورذوقوں سے بحث نہیں جنہیں دین کی صحیح سمجھ ہی عطا نہیں ہوئی' جن لوگوں نے باقاعدہ ریاض نبوت کے ان گل بوٹوں کو دیکھا ہے جن کی ترتیب و تزئین میں محدثین نے بڑی بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں وہ جانتے ہیں کہ تنہا ان کی ادبی حیثیت کتنی اونچی ہے۔ انبیاء علیہم السلام جہاں اپنے ماننے والوں کو زندگی کا ایک صحیح نظام عطا کرتے ہیں' زمانے کی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں' عمل و سیرت کے نقوش کو اجاگر کرتے ہیں اور تہذیب و ثقافت کے ہزاروں باریک نکتے

سمجھاتے ہیں' وہاں قوم کو ذوق ادب بھی عطا کرتے ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام ایک معیار اور نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے جس ذوق اور جس معیار کے حامل ہوں گے اسی طرح کا ذوق و معیار ان کے ماننے والوں میں بھی ابھرے گا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امت محمدیہ علیہ الصلوۃ والسلام کو اس نعمت سے خصوصیت سے نوازا گیا ہے۔ آج بھی دنیا بھر کے ادب کو کھنگال ڈالئے خالص ادبی حیثیت سے اسلامی لٹریچر کا جائزہ لیجئے۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اس میں جو جمال ہے' جو رعنائی اور خوبیاں ہیں وہ کہیں نہیں ملیں گی' یہ ایک مستقل موضوع ہے' تحقیق و تنقید کا کہ دنیا کے لٹریچر میں اسلامی ادب کا کیا مقام ہے؟ یقین جانئے کہ جب کبھی اس پر غور کیا گیا اور لکھا گیا تو یہ بجائے خود ایک بہت بڑی خدمت ہو گی عالمی ادب کی' اس مختصر تمہید کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ نبوت بھی ایک حسن ہے اور حسن کی پہچان کے جہاں اور بیسیوں پیمانے ہیں وہاں ایک پیمانہ ادب و ذوق کی شائستگی کا بھی ہے اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ پیمانہ نسبتاً زیادہ واضح ہے۔ اس صدی میں جب ایک شخص ادعائے نبوت کے ساتھ ہمارے سامنے آئے گا اور قرآن کے اس معیار کے بعد آئے گا تو لامحالہ ہم سب سے پہلے اسی پیمانے سے اسے جانچیں گے۔ ہماری کم سے کم توقعات اس سے جو ہوں گی وہ یہ ہوں گی کہ اس نے اگرچہ قوم کے سامنے کوئی لائحہ عمل نہیں رکھا' زمانے کے مسائل کو نہیں سمجھا' موجودہ تقاضوں پر نظر نہیں ڈالی' سیرت و عمل کے اعتبار سے کوئی بلند تر نمونہ نہیں چھوڑا' کم از کم اتنا تو کیا ہوتا کہ ابوالکلام کا "الہلال" اس کے جمال ادبی کے سامنے گہنا جاتا۔ حالی کا وہ مسدس جو نصف صدی سے گونج رہا ہے

خاموش ہو جاتا اور حکیم الامت ڈاکٹر اقبال کی شاعری اس کی چاکری کرتی' یہ کیا بدمذاقی ہے کہ براہین احمد یہ شب ہجراں سے بھی زیادہ طویل ہونے کے باوجود ایک پیرا اور جملہ اپنے اندر ایسا نہیں رکھتی کہ جس سے ذوق کی تسکین ہو سکے۔ کیا یہی نبوت ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کا معیار بھی معاذ اللہ بدلتا رہتا ہے۔ یعنی یا وہ زمانہ تھا کہ زبور عطا کرتا تھا جس سے پہاڑوں کے کلیجے متاثر ہوتے' طیور اس کے نغموں پر سر دھنتے' وہ انجیل اتارتا' جس سے کہ یونانی و رومی اپنی حکمت و فلسفہ بھول جاتے اور ان لوگوں کے پیچھے ہو لیتے جنہوں نے کہیں تعلیم نہیں پائی۔ قرآن میں ادب کے ان ان معجزات کو نازل فرماتا کہ مخالفین بھی سنتے تو رقت طاری ہو جاتی۔ (تفیض اعینهم من الدمع) اور اب یہ حال ہے کہ "خاکسار پیپر منٹ" اور "کمترین کا بیڑا غرق" ایسے عجائب سے نوازا جا رہا ہے؟ کیا یہ الہامات اسی چشمہ علم و حکمت کا ترشح ہیں جس سے زبور کے نغمہ ہائے شیریں نے استفادہ کیا جس کی سطح سے سلیمان علیہ السلام کے امثال و کلمات ابھرے جس سے انجیل نے فیض پایا اور سب سے آخر میں جس کی تجلیات نے قرآن کی ایک ایک آیت کو روشنی بخشی۔

کیا یہ پیغمبر ہے؟ (ایک نفسیاتی تجزیہ)

نبوت کی پرکھ کے کئی انداز ہیں' ایک انداز اس کی روزمرہ کی زندگی کا ہے' اس میں ایسا سلجھاؤ' ایسی پاکیزگی اور بلندی ہونا چاہئے کہ وہ عام انسانوں سے قطعی مختلف ہو' ایک انداز دوسروں سے معاملہ کا ہے' یہ بھی ایسا ہونا چاہئے کہ اس پر "حقوق العبادس" کی بنیاد رکھی جا سکے۔ کچھ لوگ معجزات و خوارق کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کریں گے اور کچھ لوگ صرف تعلیمات کو معیار ٹھہرائیں

گے کہ اس سلسلہ کی اہم کڑی یہی ہے کیونکہ اگر ایک شخص دعویٰ نبوت کے ساتھ ساتھ ایسا پیغام بھی پیش کرتا ہے جو تمام انسانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور جس سے زندگی کی تمام الجھنیں دور ہوتی ہیں تو بلاشبہ یہ اللہ کا پیغمبر ہے اور اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی پہچان کی یہ مختلف کسوٹیاں اس لئے ہیں کہ ہر شخص کا ذوق دوسرے سے علیحدہ ہے اور وہ مجبور ہے کہ اپنے ذوق کی رعایت بہر آئینہ ملحوظ رکھے۔ علم الاخلاق کے نقطہ نظر سے ایک شخص یہ دیکھے گا کہ یہ شخص جو نبوت کا داعی ہے کس ڈھب کے اخلاقیات کو پیش کرتا ہے؟ کیا یہ کسی منضبط نظام کے تابع ہے؟ کیا اس لائق ہے کہ اسے انسانی معاشرہ کے سامنے بطور نصب العین کے پیش کیا جائے۔ عمرانیات کے ماہریوں دیکھیں گے کہ یہ جس ضابطہ حیات کو پیش کرتا ہے کیا اس سے زندگی کی گاڑی کامیابی سے آگے بڑھتی ہے؟ اور ایک سیاسی دماغ اس کی دعوت میں ایک ایسے چوکھٹے کی تلاش کرے گا جس میں ایک ہموار' متوازن اور صحیح صحیح زندگی کے نقشے کی تمام چولیں عمدگی سے بٹھائی جا سکیں۔ غرض نبوت ایک ایسی سچائی ہے جس کو کسی کسوٹی پر پرکھئے' کسی ڈھب سے دیکھئے اور کسی ترازو سے تولئے یہ سچائی ہی رہے گی اور اس کے وزن یا قیمت میں سرمو فرق نہیں پیدا ہو گا۔ آج ہم قارئین کے سامنے فکرونظر کا بالکل نیا پیمانہ پیش کرنا چاہتے ہیں جس کو ملحوظ رکھ کر مرزا صاحب کی پیغمبرانہ صلاحیتوں کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کیا ایسا شخص کسی عقلی اعزاز کا مستحق ہے وہ پیمانہ ہے نفسیات کا اور یہ وہ فن ہے جس سے ایک شخص کے اس مزاج کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوتا ہے۔ خارجی زندگی جس کا مظہر ہوتی ہے کیونکہ نفسیات کا یہ مانا ہوا اصول ہے کہ ہماری زندگی کا ہر ہر طور

تابع ہوتا ہے اس بنے اور ڈھلے ہوئے نظام کے جس کا گہرا تعلق ہمارے نفس باطن سے ہے' یہ نظام یا مزاج نفسی جتنا اعلیٰ اور باقاعدہ ہو گا ہماری خارجی زندگی بھی اسی نسبت سے اعلیٰ اور باقاعدہ ہو گی اور پیغمبر کے متعلق یہ بھی نہ بھولئے کہ جہاں وہ حق و صداقت کا پیکر ہوتا ہے وہاں اس کا نفسیاتی مزاج بھی نہایت عمدہ' نفیس اور منضبط ہوتا ہے۔

اس علم کی دسترس اتنی زبردست ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے زندگی کے بڑے بڑے بھید معلوم ہو جاتے ہیں' چند مثالوں سے اس کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کیجئے' فرض کیجئے ایک شخص کے بال الجھے ہوئے ہیں اور وضع میں بے قاعدگی اور بے ترتیبی ہے تو اس سے یہ معلوم ہو گا کہ اس کے ذہن میں سلجھاؤ یا قرینہ کا احساس مفقود ہے یا یہ شخص جمالیات کے ذوق سے قطعی محروم ہے۔ ایک شخص کی یہ عادت ہے کہ جب سوتا ہے تو پوری طرح منہ ڈھانپ کر' اس سے اس کی یہ کمزوری معلوم ہو گی کہ یہ زندگی کے مصائب میں گریز اور فرار کو زیادہ پسند کرتا ہے اور اس میں مقاومت اور مقابلہ کی صلاحیتیں کم ہیں' اسی طرح فرض کیجئے ایک شخص بار بار گفتگو کرتے وقت اپنے متعلق زیادہ تفصیلات بیان کرتا ہے اور اپنی ذات کو بات چیت کا مرکز و محور ٹھہراتا ہے تو ایسا شخص اس وہم میں مبتلا ہے کہ لوگ اس میں کم دلچسپی لیتے ہیں حالانکہ وہ اس سے زیادہ کا مستحق ہے۔ اسی طرح جو شخص بلاضرورت اپنی پرہیز گاری کے ڈھونڈرے پیٹتا ہے وہ درحقیقت اس جھول کو دور کرنا چاہتا ہے جو اس کی واقعی زندگی میں پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی ہماری زندگی کی ایک ایک حرکت ایک ظہور نپے تلے نظام کے تابع ہے جو ہمارے باطن میں کارفرما ہے' اس اصول کو سامنے

رکھئے اور سردست مرزا صاحب کی ایک حرکت کا نفسیاتی جائزہ لیجئے۔

آپ کی کتاب ہے "نورالحق" اس میں پادری عماد الدین کے خرافات کا جواب مندرجہ ہے' ہم جواب کی اہمیت پر غور کئے بغیر جو ٹکڑا غور و فکر کے لئے آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک جگہ بھنا کر اپنے پادری عمادالدین کو ملعون قرار دینا چاہا ہے ہم اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ عربی اور اردو میں اس کے معنوں میں کیا اختلاف ہے' جو چیز غور طلب ہے وہ ملعون قرار دینے کی نوعیت ہے' آپ نے لعنت لعنت کی جو گردان شروع کی ہے تو ان کا نمبر پورے ایک ہزار تک جا پہنچایا ہے۔ یعنی کتاب میں ایک ہزار مرتبہ گن کر اور اس پر باقاعدہ نمبر ڈال کر' لعنت کا لفظ زیب قرطاس فرمایا ہے۔ بتائیے نفسیات کے ادنیٰ طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس حرکت کی آپ کیا توجیہ فرمائیں گے۔ یہ واضح رہے کہ موقع کی مجبوری سے علیہ اللعنۃ کہہ دینا یا یہ کہنا کہ اس پر ہزار لعنت ہے یہ اور بات ہے' ہم اس کے جواز و مواقع جواز پر نظر نہیں ڈالیں گے اور گن گن کر ہزار مرتبہ لعنت لعنت کی گردان کرنا بالکل شے دیگر ہے۔ یہ وہ حرکت ہے جو نفسیات کا دلچسپ موضوع بن سکتی ہے اور جس سے مرزا صاحب کی نفسیات کا تجزیہ ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ لکھنے والے کی طبیعت میں گھٹیا پن ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ظرف عالی نہیں اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص دماغی توازن کھو بیٹھا ہے' یہ ظاہر ہے کہ وہ شخص جو رہنمائی کی پاکیزہ غرض سے آیا ہو اس کو تعصبات کے اعتبار سے ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے اس کے لئے تو یہ زیبا ہے کہ وہ بہت سنجیدہ' بہت اونچا اور متوازن ہو' اس کی باتوں اور تحریروں

سے یہ مترشح ہونا چاہئے کہ اس کا دل و دماغ صحیح اور ٹھنڈا ہے یہ جب خوش ہوتا ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور جب بگڑتا ہے تو اس رکھ رکھاؤ اور سلیقے کے ساتھ کہ اس کے مرتبہ و مقام کو کوئی گزند نہ پہنچے اور دشمن انگاروں پر لوٹنے لگے اور مرزا صاحب کی اس حرکت سے دشمن کو تکلیف تو کیا پہنچے گی البتہ وہ ان کی اس خفیف الحرکتی پر الٹا ہنسے گا کہ عجب مسخرے سے پالا پڑا ہے کہ جس کو گالی دینا بھی نہیں آتا گالی میں بھی اتنی جان تو ہو کہ اس کو ہزار مرتبہ دہرانا نہ پڑے۔

دو مختلف دعوے (نبوت....... تجدید)

انبیاء علیہم السلام کو جہاں فکرو عمل کی سینکڑوں خوبیوں سے بہرہ مند کیا جاتا ہے وہاں کھل کر اور وضاحت سے کہنے کی صلاحیت خصوصیت سے ان کو عطا ہوتی ہے۔ یعنی ان میں یہ ملکہ ہوتا ہے کہ بات ایسے انداز اور ڈھب سے کہیں کہ سننے والے کے دل میں اتر جائے اور ایک متعین اثر پیدا کرے' یعنی ان کی دعوت کی حقانیت اور سچائی میں شبہ ہو تو سننے والے اس غلط فہمی میں ہرگز نہیں رہتے کہ یہ کہتا کیا ہے؟ زیادہ واضح اسلوب میں یوں سمجھئے کہ انبیاء علیہم السلام جب تشریف لاتے ہیں اور اپنے پیغام کو دنیا تک پہنچاتے ہیں تو وہ اپنے منصب اور دعویٰ کو اس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ مخاطبین اولین کیلئے انکار کی گنجائش تو نکل سکتی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی دعوت کی حقیقت ہی سرے سے ان پر مشتبہ ہو جائے بالخصوص ان لوگوں پر مشتبہ ہونا تو قطعی قرین عقل نہیں جو پہلے ماننے والے ہیں جنھوں نے ان کی تعلیمات کو اپنے کانوں سے سنا' کتابوں اور صحیفوں کو پڑھا اور خلوت و جلوت میں ان کے ساتھ شریک رہے۔ یہ تو بلاشبہ ہوا ہے کہ جب یہ پاکباز گروہ دنیا سے اٹھ گیا تو اس دعوت کی

مختلف تعبیریں ہونے لگیں بلکہ اس کی تعیین تک میں شک و شبہ کی آندھیاں چلنے لگیں لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ مومنین کی صفوں میں اس کا بنیادی اختلاف رونما ہو جائے جو اصل دعوت اور منصب ہی پر پردے ڈال دے۔ عقیدت و غلو نے بارہا ایک پیغمبر کو جو اللہ کا فرستادہ اور بندہ ہوتا ہے الوہیت کی چوٹیوں تک پہنچایا ہے مگر یہ کبھی نہیں ہوا ہے کہ اس کے ماننے والوں میں اس موضوع پر بحث چل نکلے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا یا نہیں؟ اور پھر یہ بحث بھی ایسی بے ڈھب کہ خود اس کی کتابوں سے دونوں طرح کی تائیدات مہیا ہو سکیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام سب سے پہلے جس چیز کو صفائی اور وضاحت سے پیش کرنے پر مامور ہیں وہ یہی ان کا منصب اور دعوت ہے یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں ہمیں تین ہی طرح کے گروہ ملتے ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے اللہ کا رسول مان لیا' دوسرا وہ جنہوں نے انکار کیا اور تیسرا وہ جن پر جہل اور غلو کی وجہ سے ان کی دعوت مشتبہ ہو گئی' مگر یہ واضح رہے کہ یہ گروہ مخاطبین اولین اور مومنین کا نہیں ہوتا بلکہ ان میں کچھ تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو براہ راست ان ذرائع تک دسترس ہی نہیں رکھتے جو حقیقت تک پہنچا سکیں اور کچھ وہ مخالف ہوتے ہیں جو دینی حقیقت کو عمداً عقیدت و محبت کے روپ میں پیش کر کے بگاڑنا چاہتے ہیں جیسے عیسائیت کے معاملہ میں ہوا کہ پولوس نے اس وقت تک حضرت مسیح علیہ السلام کی پرزور مخالفت کی جب تک وہ ان میں موجود رہے پھر جب اس نے دیکھا کہ اب میدان صاف ہے تو اپنی نبوت کا ڈھونگ رچایا اور عیسائیت کے خدوخال تک کو مسخ کر ڈالا لیکن انبیاء علیہم السلام کی پوری تاریخ میں اس حقیقت کی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ ایک شخص نے تو نبوت کا اونچا

دعویٰ کیا ہو اور اس کے ماننے والوں نے اور مخاطبین اولین نے پوری دیانتداری سے اس سے کہیں کم درجے کا اسے اہل سمجھا ہو' یعنی جوش محبت اور غلو عقیدت نے انبیاء علیہم السلام کو خدا کے جاہ و جلال کا پیکر تو ٹھہرایا ہے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خود ماننے والوں نے اسے نبوت کی بلندیوں سے نیچے اتار لیا ہو اور تجدید و اصلاح کی مسند پر لا بٹھایا ہو' یہ خصوصیت صرف مرزا صاحب کو حاصل ہوئی ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آخر وقت تک خود ان کے ذہن میں یہ کھٹک رہی کہ میرا منصب کیا ہے' کیا میں واقعی اللہ کا نبی ہوں یا صرف تجدید و اصلاح کے منصب پر مجھے ٹرخایا جا رہا ہے؟ بات یہ ہے کہ مرزا صاحب لہری آدمی تھے جب کبھی خوش فہمیوں نے زور مارا تو نبوت کے فراز اعلیٰ تک اچھل گئے اور پیغمبرانہ بلندیوں تک کو چھو آئے اور جب دماغ متوازن ہوا اور مور کی طرح اپنے پیروں پر نظر پڑی تو عاجزی کی لہر طاری ہو گئی اور آپ نے یہ کہنا شروع کیا کہ توبہ توبہ میں نے نبوت کا ادعا کب کیا ہے؟ میں تو صرف آنحضرت ﷺ کا امتی ہوں اور سوا تجدید کے اور کسی شے کا مدعی نہیں؟ سوال یہ ہے کہ جس شخص کے ذہن میں الجھاؤ ہو جو خود اپنے منصب سے متعلق یقین کے ساتھ کوئی رائے نہ رکھتا ہو اور جو بیک وقت متضاد دعاوی کی رٹ لگاتا ہو کیا ایسا شخص ذہنوں میں کوئی سلجھاؤ پیدا کر سکتا ہے کیا اس کے ماننے سے دماغوں میں روشنی کی کوئی کرن آ سکتی ہے؟ چنانچہ مرزائی ذہنوں میں جو ایک طرح کی پیچیدگی اور پریشانی آپ محسوس کرتے ہیں اور تناسب اور سلجھاؤ کا فقدان پاتے ہیں تو یہ درحقیقت نتیجہ ہے اسی نمونے کا جس نے تربیت ہی ایسی پائی ہے فکر و نظر کی ٹیڑھ اور ژولیدگی سے اب ہر ہر مرزائی پر اس کا یہ اثر ہے کہ استواری کے

ساتھ یہ کسی مسئلہ پر غور ہی نہیں کرتے۔

مجازی نبی اور ظلی نبی

مرزا صاحب کی کتابوں میں اتنا الجھاؤ' تکرار اور ذوق صحیح سے محرومی و تہی دستی کا مظاہرہ ہے کہ کوئی شخص بھی انہیں بالاستیعاب نہیں پڑھ سکتا۔ بلکہ خود ذوق صحیح کی پہچان ایک طرح سے یہ ہے کہ پڑھا لکھا آدمی اس معاملہ میں سپر ڈال دے اور اپنے عجز کا پوری طرح اعتراف کرے' یعنی سوائے ایک طرح کے مراق اور بدذوقی کے یہ ناممکن ہے کہ ان کی کتابوں سے شغف پیدا ہو سکے۔ میرا اپنا یہ حال ہے کہ بارہا ان کی کتابیں پڑھنے کا عزم کیا' بظاہر کتاب ہاتھ میں اٹھا بھی لی لیکن چند ہی صفحے پڑھنے کے بعد دیکھا کہ دل و دماغ قطعی بغاوت پر آمادہ ہیں' ناچار ہمت ہار دی اور کتاب رکھ دی' صرف ایک دلچسپی البتہ ان میں ایسی ہے جو مطالعہ پر کبھی کبھی اکساتی ہے اور وہ ہے ان کا روایتی تضاد اور بے تکا پن' ایک ہی صفحے میں بسا اوقات یہ اتنی مختلف اور متضاد باتیں کہیں گے کہ آپ کا محظوظ ہونا قطعی ہے۔ زیادہ پرلطف حصہ ان کی کتابوں کا وہ ہوتا ہے جہاں یہ اپنے منصب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہاں دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے کہ یہ ایک دم کتنا اونچا اٹھتے ہیں اور پھر کس تیزی سے زمین پر آ رہے ہیں۔ کبھی تو یہ گمان ہوتا ہے' نبوت کے تمام فرازوں کو انہوں نے آن کی آن میں طے کر لیا اور لاہوت کے کناروں کو چھو آئے اور کوئی فضیلت ایسی نہیں چھوڑی جس کا انتساب انہوں نے اپنی طرف نہ کیا ہو اور کبھی عجز و انکسار کا یہ عالم کہ ایک ادنیٰ و حقیر مسلمان ہیں جن میں کوئی تعلی اور ادعا نہیں۔ طبیعت کا یہ اتار چڑھاؤ پوری تحریرات میں چھایا ہوا ہے جب نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں تو ابن مریم علیہ السلام

کو بھی خاطر میں نہیں لاتے بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر منم محمد و احمد تک کا نعرہ مستانہ مارتے ہیں اور نہیں شرماتے' پھر جب اعتراضات سامنے آتے ہیں تو اپنا مقام اتنا گرا لیتے ہیں کہ انہیں دائرہ اسلامیت میں رکھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے' جھوٹا اور سچا ہونا تو خیر ایک الگ بحث ہے یہاں اصلی مصیبت یہ ہے کہ مرزا صاحب عمر بھر اس چکر سے نہیں نکلے کہ یہ کہاں کھڑے ہیں؟ ان کا دعویٰ کیا ہے؟ لوگ انہیں کیا سمجھیں اور کیا جانیں' ان کا کمال یہ ہے کہ اس کے باوجود یہ تضاد اور تناقض کو بڑی حکمت سے باہم سمو دیتے ہیں۔ مثلاً ایک ہی وقت میں یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ غیر تشریعی اور ظلی نبی ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ مجازی نبی ہیں حالانکہ ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ غیر تشریعی اور ظلی نبوت کے یہ معنی ہیں کہ یہ نبوت کی ایک قسم ہے جس میں ان کے عقیدے کے مطابق دعویٰ تو ہوتا ہے۔ الہامات سے بھی نوازا جاتا ہے مگر شریعت یا پیغام نہیں ہوتا اور مجازی کے معنے اس کے بالکل الٹ ہیں' یعنی غیر حقیقی' ان دونوں میں جو فرق ہے اس کو یوں سمجھئے کہ مرزا صاحب جب اپنے کو کوئی اور غیر تشریعی نبی قرار دیتے ہیں تو وہ اپنے لئے مراتب نبوت میں سے ایک ادنیٰ مرتبہ' چن لیتے ہیں' لیکن جب وہ کہتے ہیں کہ ان کی نبوت مجازی ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ سرے سے منصب نبوت پر فائز ہی نہیں اور ان کو جو نبی کہا جاتا ہے تو وہ محض ایک پیرا یہ بیان ہے جیسے کوئی شخص اپنے گدھے کو ازراہ محبت اسپ تازی کہہ دے یا اسپ تازی کو شیر قرار دے تو اس سے اس کی حقیقت نہیں بدلے گی۔ گدھا' گدھا ہی رہے گا اور گھوڑا گھوڑا ہی' گویا غیر تشریعی نبی اور تشریعی نبی میں فرق مرتبہ کا ہے اور مجازی نبی اور نبی میں فرق نوعیت کا ہے

لیکن مرزا صاحب کا یہ اعجاز ہے کہ وہ ان دونوں کو اس طرح اپنے میں جمع کر لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان کے ذہن کا یہی الجھاؤ لاہوری و قادیانی تفریق کا ذمہ دار ہے۔ تعجب ان پر نہیں یہ تو بے چارے اپنی افتاد طبیعت سے بہر آئینہ مجبور تھے' تعجب ان لوگوں پر ہے جو اس زمانے میں ان کو مانتے ہیں' آج دور صاف صاف اور دو ٹوک بات کہنے کا ہے' یعنی یا تو آپ کا ایک متعین منصب ہے اور یا نہیں ہے۔ یہ پیچ دار باتیں اور چناں چنیں کے قصے اس زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس عہد میں ذہن و فکر کی مشغولیتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ایسا الجھا ہوا انسان قطعاً کامیاب نہیں ہو سکتا' ذہنی خوبیاں ہی تو ایک ایسی چیزیں ہیں جن کی بناء پر ایک پیغمبر اپنے ہم عصروں سے ممتاز ہوتا ہے اور اگر اسی نعمت سے یہ حضرت محروم ہیں اور ذہن ہی میں استواری اور استقامت نہیں تو دعویٰ نبوت کس برتے پر' ہمارے نزدیک نبوت فکری ارتقاء اور فکری سلجھاؤ کا آخری مقام ہوتا ہے اور جس کو ہم نبی قرار دیتے ہیں اس کے متعلق یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ وہ بہترین صلاحیتوں سے بہرہ مند ہے۔

نبوت اور ذوقِ شعری

مناظرہ بازی کو ہم ابتداء ہی سے صحیح نہیں سمجھتے کیونکہ یہ کسی اعتبار سے بھی مفید نہیں بعض وقتی فوائد جو اس سے حاصل ہوتے ہیں ان میں مضرت و نقصان کے کئی عظیم پہلو پنہا ہوتے ہیں جو بادی النظر میں گو دکھائی نہیں دیتے مگر تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ان کا سراغ لگا لینا کچھ بھی دشوار نہیں۔ مناظرہ بازی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس سے ایک مخصوص دفاعی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے اور انسان دین کے مسائل میں غور و فکر کا ہمیشہ ایک ایسا انداز اختیار کرتا ہے جس پر دوسرے

کیمپ سے لوگ اعتراض نہ کرسکیں۔ رہی بات کہ اس میں حقیقت کی جھلک بھی ہوتی ہے یا نہیں تو اس کی اس کو چنداں پرواہ نہیں ہوتی۔

مناظرانہ تفسیروں میں تشریح وتفصیل کے مختلف گوشوں سے تعرض کرتے وقت یہ خطرہ ہر ایک کے پیش نظر رہتا ہے کہ جو بات بطور تاویل وتعبیر کے اختیار کی جارہی ہے اس سے مخالفین تو کوئی استفادہ نہیں کرسکتے۔ چنانچہ قادیانی تفسیر کا یہی مخصوص ڈھب ہے جو قطعی غلط ہے۔ ان کے ذہنوں پر ہر وقت آریہ سماجی، عیسائی مشنری اور مستشرقین سوار رہتے ہیں اور یہ ان کی اعتراضات کی روشنی میں قرآن کے عقدوں کو سلجھاتے ہیں۔ ہمارا یہ وطیرہ نہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بجائے خود ایک مثبت حقیقت ہے اور اس لائق ہے کہ اس کے مطالب کی توضیح کرتے وقت صرف یہی سامنے رہنا چاہیے۔ اس کے مزاج، حدودِ ادبی، لغوی نمائشوں کو ملحوظ رکھا جائے اور محض یہ دیکھا جائے کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے ان مطالب پر اپنے قول و عمل سے کیونکر روشنی ڈالی ہے۔ جب اس طریق سے قرآن کی کسی آیت کا مطلب واضح ہو جائے تو ہم اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس پر کس کس کیمپ کی طرف سے کیا کیا اعتراض وارد ہوتا ہے، کون کون لوگ اس سے کیا کیا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ ان کا جواب دینا یقیناً ہمارے فرائض میں داخل ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اعتراض کو اتنا وزن دیا جائے کہ تعبیر وتاویل کی قدرتی سمتیں ہی بدل جائیں اور معنی حقیقت میں اور اعتراض کے پیش نظر اپنا مؤقف ہی چھوڑ دیں اور مصنوعی اور غیر استوار مورچوں پر آرہیں۔ اسی طرح اس احتیاط کو ہم بے وقوفی سمجھتے ہیں کہ ہماری تاویل سے کوئی ملحد اپنے مطلب کی چیز نہ نکال سکے۔ ہماری رائے میں بات صحیح کہنا شرط ہے اگر کوئی شخص اس صحیح بات سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے تو اس کی

ذمہ داری کہنے والے پر نہیں خود اس پر اور اس کے غلط اندازِ فکر پر عائد ہوتی۔

اس تمہید کے بعد اصل قصہ سنئے!

الاعتصام 9 فروری 51ء کی اشاعت میں ہم نے تفسیر کے کالم میں اس موضوع پر بحث کی ہے کہ قرآن کن معنوں میں ''معجزہ'' ہے۔ اس ضمنی سوال پر بھی روشنی ڈالی تھی کہ کیا قران تفسیر ہے اور اس کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ مکہ والے باوجود اس کے کہ اچھا خاصا ذوقِ شعر رکھتے تھے اور نظم و نثر کے فرق کو بخوبی سمجھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے بارے میں یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ یہ شاعر ہیں، یہ ظاہر ہے کہ شاعر سے مراد یہ ہرگز نہیں ہوسکتی تھی کہ قرآن فی الحقیقت ایسا کلام ہے جس پر شعر کا دھوکا ہوسکتا ہے۔ ہم نے اس مضمون میں بتایا تھا کہ اگرچہ قرآن حکیم بلا اختلاف نثر ہی میں ہے۔ تاہم اس میں شعر کی وہ تمام کیفیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں جو شعر کو شعر کا درجہ بخشتی ہیں۔ یعنی وہی ترنم ہے، وہی تناسب ہے، وہی زیر و بم ہے، وہی الفاظ و حروف کی موزونیتیں ہیں، مگر اس کے باوجود جب صاحبِ قرآن کو شاعر کہا تو اس سے ان کا مقصد یہی ہوسکتا تھا کہ جس طرح شعراء غیر حقیقی خیالات سے کلام کی رونق و عمدگی کا سامان مہیا کرتے ہیں اسی طرح قرآن بھی ایک طرح کی غیر حقیقی بلند پروازی ہے۔

اعتراض کے اس پہلو کو سامنے رکھ کر قران حکیم نے اس الزام کی تردید کی۔

وَمَا عَلَّمْنَٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ (یسین:٦٩)

''اور نہیں سکھایا ہم نے اس کو شعر اور نہ ہی شاعری اس کے لائق ہے''

کہ کذب و اختلاق کی یہ نوعیت جسے تم شعر کہتے ہو یا شاعری سے تعبیر کرتے ہو اس کی ہم نے تعلیم نہیں دی اور نہ انبیاء علیہم السلام کو یہ زیب ہی دیتا ہے کہ وہ حقائق کو

چھوڑ کر خیالات واوہام کی وادیوں میں بھٹکتے پھریں۔ ان کا کام تو یہ ہے کہ زندگی کی سچائیوں کا سامنا کریں اور انسان کو ان سچائیوں کے بارے میں صحیح صحیح معلومات بہم پہنچائیں جو ان کی دنیا و عقبیٰ پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔

اس وضاحت سے مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری جامعہ احمدیہ کے پرنسپل ہیں بہت خوش ہوئے ہیں کہ لیجئے، مرزا صاحب پر جو یہ اعتراض چلا آ رہا تھا کہ اگر وہ پیغمبر ہیں تو انہوں نے شعر گوئی کو تبلیغ کا ذریعہ کیوں ٹھہرایا، رفع ہوا۔ حالانکہ ہمارا یہ اعتراض ہی ان پر سرے سے نہیں ہے کہ ان کے کلام میں شعر و ادب میں پاکیزہ نمونے کیوں نہیں ملتے، ہمارا تو اعتراض اس کے برخلاف یہ ہے کہ وہ پیغمبر ہو کر ذوق ادب سے اس درجہ محروم کیوں ہیں؟ ان کی نثر کیوں اتنی پھیکی، بے جان اور ادبی نکھار سے عاری ہے اور ان کے اشعار کا یہ عالم کیوں ہے کہ ان میں ''تابند ھے ازار'' ایسے درِ ثمین کی جھلک ہے۔ یا ''ہوں بشر کی جائے نفرت'' ایسی ترکیبیں کیوں پائی جاتی ہیں، جب کہ ان سے صاف طور پر ذم کے پہلو کا اظہار ہوتا ہے۔

مرزائیت کی تردید میں، ذوقِ ادب کو ہم اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ دوسری کوئی چیز اس درجہ مؤثر نہیں ہمارے نزدیک یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک عربی پڑھا ہوا مولوی مرزائیت کو قبول کرے مگر یہ ناممکن ہے کہ باذوق ادیب مرزا صاحب کی کتابوں سے متاثر ہو سکے کیونکہ ذوق کا فیصلہ دوٹوک ہوتا ہے، اس کے سامنے علم کی طرح ماننے یا نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے سامنے یہ سوال ہوتا ہے کہ کوئی اندازِ تحریر کس حد تک اس کے حسِ جمالیات کو بیدار کرتا ہے۔ دلیل بھٹک سکتی ہے، استدلال کا فیصلہ غلط ہو سکتا ہے، مگر ذوق کبھی دھوکہ نہیں کھاتا۔ ہزار دلائل ایک طرف صرف ایک دلیل ان سب پر حاوی اور مرزائیت کے کذب پر برہان

ساطع ہے کہ یہاں نبوت کے ساتھ ادب و ذوق کی وہ بخششیں کیوں موجود نہیں جو نبوت ورسالت کو مستلزم ہیں۔

’’جھوٹا نبی اور سچا نبی‘‘

دونوں میں فرق کی نوعیت کیا ہے؟

مرزا صاحب کے متعلق ایک عام غلطی یہ ہے کہ یہ مانا کہ انہیں نبوت کا مرتبہ حاصل نہیں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نبوت کی بلندیوں تک ان کی رسائی نہ ہو پاتی ہومگر یہ کیسے ممکن ہے کہ سرے سے نیکی اور تقوی کے کسی درجہ کا اہل ہی انہیں نہ سمجھا جائے۔

یعنی اگر ایک شخص شمس العلماء یا مسیح الملک نہیں ہو سکا تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ جید عالم یا اچھا خاصا طبیب بھی نہ ہو، زیادہ وضاحت کے لئے یوں سمجھئے کہ اگر ایک فاضل محقق (ڈاکٹریٹ) کی سند نہیں پا سکا تو اتنا تو بہر آئنہ ماننا ہی پڑے گا کہ اس کا علمی پائیہ ضرور بلند ہے۔

نبوت چونکہ صلاح وتقویٰ سے بہت آگے کا ایک مقام ہے اس لئے اگر کسی شخص سے متعلق جھگڑے اور بحث کی نوعیت یہ ہو کہ آیا وہ نبی ہے یا نہیں ہے؟ تو ظاہر ہے کہ یہ اعتراف فریقین میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھے گا کہ کم از کم اس کی ولایت وخدا پرستی میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔

اس غلط فہمی کا سبب کئی منطقی مغالطے ہیں پہلا مغالطہ یہ ہے کہ اس میں نبوت کو بھی اسی طرح کی اکتسابی شئے قرار دیا گیا ہے جس طرح کہ علوم وفنون یا محاسن اعمال کہ یہ دونوں طرح کی چیزیں کسب ومحنت سے حاصل ہوتی ہیں حالانکہ نبوت اللہ کی ایک مخصوص بخشش اور متعین دین کا نام ہے۔

دوسرا مغالطہ اسی سے ملتا جلتا یہ ہے کہ نبوت کو ایک الگ حقیقت اور منفرد شے قرار دینے کے بجائے یہ سمجھا جائے کہ محاسنِ اعمال یا تقویٰ کی مخصوص رفتار ہے جس کا ایک ارتقاء ہے اور اس رفتار اور ارتقاء کا ایک اسٹیشن یا ٹھہراؤ نبوت ہے، لہذا جب تک عقیدہ و عمل کی گاڑی پاک بازی و حسنِ عمل کے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں سے آگے نہیں بڑھ جاتی اس وقت تک اس بڑے اسٹیشن تک نہیں پہنچتی۔

تیسرا بہلاوہ اس میں یہ ہے کہ ہم نبوت کو اس ڈھنگ کی چیز سمجھتے ہیں کہ اس کا صحیح یا غلط ہونا عقیدہ و عمل کے کسی گوشہ پر اثر انداز نہیں ہوتا حالانکہ یہی غلط ہے۔ نبوت اگر صحیح ہے تو سرمایہ صد رحمت و برکت ہے اور اگر غلط ہے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی گمراہی اور ضلالت نہیں ہو سکتی۔

نبوت کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ تو مشکل ہے، تین موٹی موٹی علامتیں البتہ ایسی ہیں جن پر یہاں غور کر لینا چاہئے اور وہ ہیں صدقِ خیال، صدقِ مقال اور صدقِ اعمال۔

☆ صدق خیال سے یہ مراد ہے کہ ایک شخص جب یہ کہتا ہے کہ میں اللہ تعالی کا نبی ہوں تو فی الواقع اللہ نے اسے اس منصب پر فائز فرمایا ہے اور وہ اس پر یقین رکھتا ہے۔ ایسا ہی محکم اور اٹل یقین جیسے یہ کہ آفتاب ہر روز چمکتا ہے، چاند مقررہ دنوں میں ہلال سے بدر ہوتا ہے اور بدر سے ہلال۔

☆ صدق مقال کے یہ معنی ہیں کہ جس سچائی کو نبی جانتا ہے، جس کی تبلیغ و اشاعت پر وہ مامور ہے اسے کسی ترغیب و ترہیب سے متاثر ہوئے بغیر بلا کم و کاست دوسروں تک پہنچائے، نہ چاندی اور سونے کے انبار اسے کتمان حق پر مجبور کر سکیں اور نہ حکومت و اقتدار کا جادو ہی ایسا ہو کہ اس کی زبان کو سچائی و خودداری کی جانب سے ہٹا کر مدح و ستائش اور خوشامد و تملق کی رذالتوں کی طرف پھیر دے۔ صدق مقال کا یہ

تقاضا ہے کہ وہ چلتی تلوار اور دہکتی ہوئی آگ کو دیکھ کر بھی توحید سے دستبردار نہ ہو۔

☆ صدقِ اعمال یہ ہے کہ جس پیغام کا یہ مدعیٔ نبوت حامل ہو اس پر خود عمل پیرا بھی ہو۔

اب اگر ایک شخص اپنے اس دعویٰ میں جھوٹا ہے کہ اللہ نے اس کو بھیجا ہے یا اللہ کی بخشش وموہبت نے اسے مامور ٹھہرایا ہے تو وہ ان تینوں خوبیوں سے محروم ہوگا اس کے عقیدہ وخیال کے تلون کا یہ عالم ہوگا کہ کبھی خدائی کے خواب دیکھے گا، کبھی نبوت کا ڈھونگ رچائے گا اور کبھی تجدید کی سیڑھیوں تک نیچے اتر آئے گا۔

☆ صدقِ مقال واعمال کی یہ کیفیت نہ ہوگی کہ معمولی گرفت پر نبوت سے دستکش ہو جائے گا اور یہ تحریر دے کر عدالت سے پیچھا چھڑائے گا کہ میں نبوت و ماموریت کے ان گوشوں کا اظہار نہ کروں گا جو وعیدی ہوں جن میں یہ مذکور ہو کہ فلاں شخص ہلاک ہو جائے گا یا مر جائیگا۔

گویا نبوت اور دعویٰ نبوت کے بعد عدمِ نبوت کی صورت میں جو فرق ہے وہ اس ڈھب کا ہے کہ اس میں کوئی قدرِ مشترک نہیں ہے کیونکہ یا تو ایک شخص فی الواقع اللہ کا پیارا اور محبوب ہے اور فی الحقیقت اللہ تعالیٰ نے اسے اس خدمت کے لئے چنا ہے اور یا پھر اسے شیطان نے بہکایا اور گمراہ کیا ہے۔ تیسری کوئی صورت نہیں۔

جھوٹا نبی نہ صرف یہ کہ اپنے ادعاء میں غیر صادق ہے بلکہ پرلے درجہ کا گمراہ اور جعلساز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس کو سب سے بڑے ظلم سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ (الصف:۷)

اور اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔

نبوت و رسالت سے متعلق ہی ایک خیال تو وجہ مسرت تھا کہ اللہ تعالی نے اس جہانِ زور و باطل میں ایسے حق آگاہ حضرات کو بھی پیدا کیا ہے جن کی زندگیاں سچائی کے بڑے بڑے معیاروں پر بھی پوری اترتی ہیں جو نفس کی خواہشات سے الگ ہو کر ماحول کی ترغیبات سے قطعِ نظر کر کے اور نظامِ باطل کی کڑی آزمائشوں سے بے نیاز ہو کر خدا کے بول کو بالا کر سکتے ہیں۔ اب اگر انہیں میں ایسے لوگ آملیں جن پر شہوت کا غلبہ ہے جو ماحول کی غلامی میں جکڑے اور بندھے ہوئے ہیں اور جو سطوت واقتدار سے اس درجہ خائف و متاثر ہیں کہ نصوص تک پر خطِ تنسیخ پھیر سکتے ہیں جن کا تبلیغی داعیہ صرف کتاب فروشی اور مناظرہ بازی تک محدود رہے تو ظاہر ہے کہ ان کے اس خیال و تصور کو کتنی ٹھیس لگے گی اور حق و صداقت کے ان معیاروں کی نسبت کتنا گھٹیا عقیدہ قائم ہوگا۔

نیکی نہ کرنا اور تقویٰ کے کسی درجہ سے محروم رہنا اگرچہ ایک طرح کی بدبختی ہے مگر تقویٰ کے بلند معیاروں کی توہین کرنا اور کردار و سیرت کے اونچے نمونوں کی نسبت سوءِ ظن پیدا کرنا اتنا بڑا جرم اور بدبختی ہے کہ ہرگز درخورِ عفو نہیں۔ لہذا جھوٹا نبی صرف اتنا ہی نہیں کہ جھوٹا ہوتا ہے بلکہ گمراہی و بے دینی کا سب سے بڑا منبع اور مرکز ہوتا ہے۔ اس سے مذہب کے اونچے خیالات کو جتنا نقصان پہنچتا ہے اور کسی سے نہیں

سخن فہمئ عالمِ بالا معلوم شد

مرزا صاحب کے مختلف اور گوناگوں دعووں میں ایک یہ بھی تھا کہ اللہ تعالی نے فہم و تفسیر کے دروازے ان پر کھول دیئے ہیں۔ اور معارف و نکاتِ قرآنی کا جو

بہرہ وران کو ملا ہے اس میں دوسروں کا کوئی ان کا ساجھا نہیں ۔ اے کاش! یہی بات صحیح ہوتی کیونکہ ان کے آنے سے بجز اس کے کہ مسلمانوں میں انتشار پھیلا ہے، بدذوقی بڑھی ہے اور انگریز کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا ملا ہے اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اگر واقعی انہوں نے قرآن کے ان دو کناروں کے درمیان کے سمندر میں جسے دفتین سے تعبیر کیا جاتا ہے شناوری کی ہوتی اور اس بحرِ ذخار کی ایک ہلکی سی موج ہی دیکھی ہوتی تو ان کی بصیرت جھوٹی نبوت کے ڈھونگ رچانے سے اس کو کہیں بہتر قرار دیتی کہ قرآنِ حکیم کے معانی و مضمرات کے انکشاف و تفحص پر عمر صرف کر دی جائے۔ کیونکہ اس غواصی اور ڈھونڈ میں جو موتی بھی ہاتھ آ جائے وہ اتنا قیمتی اور گرانقدر ہے کہ اس پر بجا طور پر ان کو ناز ہو سکتا ہے۔ مگر اس کام کیلئے جس صلاحیت، جس دماغی استعداد اور سلیقہ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تقویٰ و پاکبازی کی ضرورت ہے مرزا صاحب اس سے یکسر تہی اور کورے تھے۔ بالکل اسی ڈھنگ کا دعویٰ اکثر میاں محمود نے بھی کیا۔ حالانکہ اگر ان باپ بیٹا نے معانی و نکات کے نام سے جو کچھ لکھا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے اور ان کو طول بیانی یا مراق و ادعاء سے الگ کر کے دیکھا جائے تو جو خلاصہ رہ جائے گا وہ دو حال سے خالی نہیں ہوگا یا تو وہ نئے اور جدید نکات و معانی سے تعبیر ہوگا جس میں سواجدت کے اور کوئی خوبی نہیں ہوگی اور یا پھر وہی باتیں ہوں گی جو سب نے کہی ہیں۔ تیسری کوئی صورت متصور نہیں۔ جہاں تک قرآنِ حکیم کے وجوہ محتملہ کا تعلق ہے سلف نے ہمارے لئے وہ عظیم ترکہ چھوڑا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس میں کسی نئے نکتہ کے اضافہ کی گنجائش ہی نہیں۔ ہاں سیاق و سباق آیات سے البتہ نئے نئے معانی کا استنباط ہو سکتا ہے لیکن اس فن سے یہ باپ بیٹا دونوں ناآشنا ہیں اور یا پھر ان علوم و احوال سے متعلق کچھ کہنا ناممکن ہے۔ اجمالاً قرآنِ حکیم نے جن کی نشاندہی کی

ہے اور آج ان کی تصدیق ہو رہی ہے اس پہلو سے بھی افسوس یہ ہے کہ مرزائیت کی کوشش طفلانہ اور مضحکہ خیز ہے اور تو اور مرزائیت کو وہ زبان اور پیرایہ بیان ہی نہیں ملا جو اعلیٰ دینی مضامین کے شایانِ شان ہو۔

29 مارچ 51ء کے الفضل میں میاں محمود کا ایک کشف شائع ہوا جس میں لفظ رب العلمین کی تشریح کی گئی ہے کہ ''وہ رب صرف اسی معنوں پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ پیدا کرنے والا ہے بلکہ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ وہ نہایت ہی مناسب طور پر اس کی باریک در باریک قوتوں اور طاقتوں کو درجہ بدرجہ اور مناسب حال ترقی دیتا چلا جاتا ہے اور عالمین کا لفظ محض زمین و آسمان پر دلالت نہیں کرتا بلکہ زمین و آسمان کے علاوہ مختلف اجناس کی مختلف کیفیتوں پر بھی دلالت کرتا ہے اور یہ مضمون پہلی کتب میں بالکل بیان نہیں ہوا''۔ یہ الفاظ میاں صاحب کی ایک تقریر کا حصہ ہیں جو انہوں نے عالم رؤیا میں فرمائی۔ اس کے بعد اس نکتہ سے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ ''فی الواقعہ ایک نیا نقطہ نگاہ ہے جس کے ذریعہ سے رب العالمین کی آیت کی تفسیر ایک نئے رنگ میں اور نئے اسلوب سے کی جاسکتی ہے جو نہایت بصیرت افروز اور علم پیدا کرنے والی ہوگی''۔ یہ نیا نقطہ نگاہ جس کو بیان کرنے کیلئے میاں محمود نے کشف و رؤیا کی آڑ لی ہے کس درجہ عام وشائع و ذائع ہے اس کی تحقیق کے لئے بڑی بڑی کتبِ تفسیر کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں صرف راغب کی مفردات اٹھا کر دیکھ لی جائے کہ اس میں لفظ رب اور عالمین کے تحت کیا لکھا ہے اور پھر فیصلہ کیا جائے کہ ان کے دعووں میں سچائی کی مقدار کتنی ہے، رب سے متعلق ان کی تصریح ہے کہ الرب فی الاصل التربیة و ھوانشاء الشئی حالا فحالا الی حد التمام یعنی رب کے معنی درحقیقت تربیت کے ہیں اور تربیت یہ ہے کہ ایک شے کی تکمیل و اتمام کی جو درمیانی

منزلیں ہیں ان سب کی دیکھ بھال یا نگرانی کرنا اس لئے رب وہ ذات ستودہ صفات ہوگی جو ہر ہر شے کے تمام مضمرات مخفیہ کو وجود میں لاتی ہے اور تمام و کمال تک پہنچاتی ہے۔ عالم کی تفسیر میں ان کا کہنا ہے والعالم اسم للفلک و مایحویه من الجواهر والاعراض کہ عالم آسمان اور اعراض و جواہر سے جن جن حقائق کو وہ گھیرے ہوئے ہے سب کے مجموعہ کا نام ہے۔ عالم بصورت جمع کیوں ہے اس کے جواب میں فرماتے ہیں فلان من کل نوع من هذه قدیسمی عالما کہ کائنات کی ہر ہر نوع اور صنف کو چونکہ عالم کہا جاتا ہے اس لئے اس تنوع و کثرت کی رعایت سے عالمین فرمایا۔

اس نکتہ کی مزید وضاحت کے لئے کہ عالمین سے مراد صرف انسان یا جن و ملائکہ ہی نہیں بلکہ کائنات کا ہر ہر ظہور ہے۔ ایک روایت بھی لائے ہیں جس میں کھلے بندوں کہا گیا ہے کہ ان الله بضعة عشر الف عالم کہ اللہ تعالیٰ کے ہزاروں عالم ہیں جن کی وہ ربوبیت فرماتا ہے۔

ان تصریحات پر غور فرمایئے اور بتایئے کہ خلیفہ صاحب نے جسے نیا نقطہ قرار دیا ہے اور جس کو کشف و رؤیا میں معلوم کیا ہے اس میں کیا اچنبھا پن ہے اور کیا جدت ہے۔ اسی پر سلسلہ مرزائیہ کی تمام لن ترانیوں کو قیاس کر لیجئے۔ اس قسم کی باتیں جاہل مریدوں اور جاہل مولویوں، فاضلوں میں بیٹھ کر سنائی جا سکتی ہیں۔ لیکن انہیں کوئی شخص بھی جس کے کندھوں پر سر ہے اور سر میں بھیجا ہے حقیقت قرار نہیں دے سکتا۔ تعجب مولوی روشن دین تنویر پر ہے کہ وہ بھی اس کشوف اور رؤیا کی اشاعت پر مجبور ہے حالانکہ اس کا دل خوب جانتا ہے کہ یہ زمانہ اس طرح کی ڈینگیں مارنے کا نہیں ہے۔ ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ جماعت مرزائیہ کے پڑھے لکھے لوگوں

سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ مرزا صاحب یا میاں محمود کا سارا لٹریچر کھنگال کر کوئی تفسیری نکتہ ایسا منظر عام پر لائیں جو بشرطِ صحت نیا ہو اور جو پہلوں کو نا سوجھا ہو اور اگر ایسا نہیں کر سکتے اور یقیناً نہیں کر سکتے تو پھر اللہ سے ڈریں اور اس فریب وادعاء سے باہر نکلیں۔

اور یہ رؤیا..........

خواب کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کے کئی جواب دیئے جا سکتے ہیں بہت سادہ اور اکثر حالات میں صحیح صحیح جواب یہ ہے کہ یہ ذہن کا ایک قدرتی فعل ہے غیر معتاد حالات میں۔ یعنی اس کے سوچنے کا عام اور قدرتی ڈھنگ یہ ہے کہ یہ بیداری اور جسم کی مشینری کے ساتھ اس کا تعلق یا لگاؤ اپنی طبعی اور معتدل حالت میں قائم ہو لیکن اگر یہ نیند میں ہو یا کسی اور سبب سے اس کا ناطہ جسمانی مشینری سے بظاہر منقطع ہو جائے تب بھی یہ کام برابر کرتا رہتا ہے اور غور و فکر کے اندوختے کو پھیلاتا اور سمیٹتا رہتا ہے۔ ان حالات میں یہ دنیا کا عجیب نقشہ کھینچتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس دنیا سے بالکل مختلف دنیا کی تعمیر کرتا ہے۔ اس میں کئی آفات، موجود دنیا کے آفات سے بالکل جدا ہوتے ہیں۔ اور اس میں کے مکانیات دنیا کے مکانیات سے تو گویا کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتے۔ یہاں ہو سکتا ہے کہ ایک منٹ پھیل کر سال بھر کی وسعتوں پر چھا جائے اور سال بھر کی وسعتیں چند لمحوں میں سمٹ آئیں۔ اسی طرح یہاں کی زمین ایک جست لگا کر آسمان کو چھو سکتی ہے اور آسمان اتنا جھک سکتا ہے کہ قاب قوسین سے بھی کم فاصلہ رہ جائے۔ خواب کی یہ تعبیر مختلف فیہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ اس سے زیادہ کا بھی حامل ہے جس طرح بیداری میں روح انسانی کی یہ

صلاحیت متنازعہ فیہ ہے کہ آیا اس کا ملا اعلی سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے؟ اور نبوت کا کوئی منطقی امکان موجود ہے۔ اسی طرح یہ امر جھگڑے کا ہے کہ آیا ذہن کے اس فعل سے پیشین گوئی کا تارو پود بنا جاسکتا ہے اور اس سے مستقبل کے متعلق کوئی رہنمائی حاصل ہوسکتی ہے؟ مادیین جو ہر چیز کو مادی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں حتی کہ خود ذہن کے غور وفکر کو بھی مادی ہی قرار دیتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ خواب میں کسی نئی حقیقت کا اظہار ہرگز نہیں ہو پاتا بلکہ دراصل اس میں خواہشات وآرزوؤں کا پرتو ہوتا ہے۔ جن کو ہم عالمِ بیداری میں غور وفکر کا جز ٹھہراتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ عالمِ بیداری میں ہم ان کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو عالمِ خواب میں ذہن عطا کرتا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ خواب ان دبی اور کچلی ہوئی آرزؤں کا آئنہ دار ہوتا ہے جنہیں بیداری میں اظہار و وضاحت کے لئے مناسب اسلوب یا موقع نہیں ملتا۔

وہ لوگ جو مادہ کے علاوہ روح کو بھی ایک مستقل بالذات وجود قرار دیتے ہیں رائے رکھتے ہیں کہ بیداری میں جس طرح اللہ تعالیٰ کی عنایت سے قلب مہبط وحی بن جاتا ہے خواب میں بھی اسی طرح اس پر افاضہ انوار ممکن ہے اس کو اصطلاح میں ''رویاء'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ فی الحقیقت روح ہی کی ایک غیر معمولی جست کا دوسرا نام ہو لیکن اس میں بھی بہر آئنہ اللہ تعالیٰ کی تائید وتوفیق کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ علوم آلہیہ کی ایک تجلی ہے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک فاسق وفاجر کے قلب پر بھی بعض مناسبتوں کی رعائت سے اس کا ظہور ہو جائے مگر ایسا ہونا نادر الوقوع ہے۔ کثرت سے ایسے خواب دیکھنا جو پورے ہو جائیں ایک خاص صفت ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو نوازا جاتا ہے یہی وہ چیز ہے جسے نبوت کا جزو قرار دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ لم یبق من النبوۃ الا

المبشرات یعنی نبوت کے کواڑ تو بند کر دیئے گئے اب جو کچھ رہ گیا ہے وہ اس کا ایک حصہ ہے جسے مبشرات کہہ لیجئے۔ جب یہ حقیقت سمجھ لی گئی کہ سچا خواب ایک طرح کا افاضہ ہے اور اللہ کی بخشش ہے اور اس میں آئندہ واقعات کو ایک خاص ڈھنگ سے بیان کیا جاتا ہے تو یہ معلوم کر لینا کچھ بھی مشکل نہیں کہ خواب کی حیثیت دراصل ایک پیرایہ بیان کی ہوتی ہے۔ یعنی بیداری میں جو افاضہ کی شکل ہے اسے ہم الہام و وحی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں اللہ کی تجلی ''علم'' الفاظ و حروف میں ظاہر ہوتی ہے اور خواب میں حقیقت کا اظہار ایسے ڈھنگ سے ہوتا ہے جس میں الفاظ و حروف کی پابندی بالکل نہیں ہوتی بلکہ یہاں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آتا ہے جو تعبیر طلب ہوتا ہے اور جس کے تاویل رویاء کے اعتبار سے کچھ معنی ہوتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ تاویل رویاء کی حیثیت فن کی نہیں ذوق کی ہے۔ لہذا اس کے لئے بجے تلے قواعد نہیں ہو سکتے جس طرح سچا خواب پاکیزہ دلوں میں اپنا نشیمن بناتا ہے اسی طرح اس کے مطالب کا علم بھی ہر شخص کو نہیں دیا جاتا بلکہ اس کے لئے بھی مخصوص ذہنوں کو چنا جاتا ہے یہی وہ بات ہے جس کو سورہ یوسف میں یوں ادا کیا گیا ہے وَ یُعَلِّمُکَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تعبیر رویاء کا ذوق خاص بھی مرحمت فرمائیں گے۔

جب یہ طے ہو گیا کہ رویاء ایک طرح کا پیرایہء بیان ہے تو اس کا بدرجہ غایت پاکیزہ ہونا ضروری ٹھہرا۔ یعنی جس طرح قرآن میں یہ التزام ہے کہ نازک سے نازک جنسی مسائل کو بیان کیا جائے لیکن کہیں بھی ایسا ڈھب اختیار نہ کیا جائے جس سے ذوق صحیح مجروح ہو۔ اسی طرح یہ پرایہ بیان جو رویاء کی شکل میں ہوتا ہے اور خاص افاضہء انوار ہے جس میں ملاء اعلیٰ کی دخل اندازیوں کی جھلک ہوتی ہے جس

میں مستقبل کی خبریں ہوتی ہیں اور آئندہ کے واقعات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسا پاکیزہ، ایسا عمدہ اور نفیس ہونا چاہئے کہ ذوق پر گراں نہ ہو اور طبیعت کو سن کر اس سے تنغض نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ اس سے ایک طرح کا انشرح ہونا چاہئے۔

اس مختصر تمہید کے بعد ایک بہت بڑے مدعیٔ کشف کا ایک رویاء ناک پر رومال رکھ کر پڑھ جایئے اور پھر بتایئے کہ طبیعت کا کیا حال ہے۔؟

ہیڈنگ یہ ہے ''حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے چند تازہ رویاء وکشوف رویاء یہ ہے۔

''میں نے دیکھا کہ میں ایک جگہ قضائے حاجت کے لئے بیٹھا ہوں اور بڑی مقدار میں پاخانہ آیا ہے یہ رویاء میں نے دو دفعہ دیکھی ہے''۔

تعبیر یہ ہے ''میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جلد یا بدیر کوئی صورت بقیہ جائیدادوں کے فروخت کی یا ان کی آمد میں بڑھوتی کی ایسی پیدا کردے گا جس سے لوگوں کے قرضے آسانی سے ادا ہوسکیں گے''۔ (الفضل 22 نومبر 50ء)

کہئے اس مطلب کے لئے اس سے بہتر پیرایہ بیان نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر یہ صرف خواب ہی رہتا تو ظاہر ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ خواب اس سے بھی بے ہودہ ہوسکتا ہے، لیکن رویاء کشف کا یہ پیرایہ بیان اتنا گھناؤنا ہو۔ کیا یہ رؤیا کشف کی توہین نہیں ہے۔ اور ملاء اعلیٰ کے ذوق پر براہ راست حملہ نہیں ہے۔؟

آیت تقول کی صحیح تفسیر

اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ‌ؕ قَلِيۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ۝ وَلَا بِقَوۡلِ كَاهِنٍ‌ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ۝ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ وَلَوۡ تَقَوَّلَ عَلَيۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِيۡلِ ۝ لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡيَمِيۡنِ

ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ○ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ○

(الحآقة ٤٠ تا ٤٧)

''یہ تو معزز فرشتے کا لایا ہوا کلام ہے۔ شاعر کی بنائی ہوئی بات نہیں مگر تم ہو کہ اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ کاہنوں کی تک بندی بھی نہیں مگر تم ہو کہ عبرت پذیر نہیں ہوتے۔ یہ تو پروردگارِ عالم کی طرف سے اتری ہوئی اور آئی ہوئی دعوت ہے۔ اگر یہ پیغمبر (آنحضرت ﷺ) اپنی گھڑنت کو ہماری طرف منسوب کرنا شروع کر دیں تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیں اور رگِ حیات تک کاٹ دیں۔ پھر تم میں کوئی بھی ان کو ہماری گرفت سے روکنے والا نہ ہو''۔

بات صاف ہے اللہ تعالیٰ کو آنحضرت ﷺ کی سچائی اور صداقت کا اظہار کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ ان سے یہ توقع نہ کرو کہ یہ تمہاری خوشنودی کیلئے ہماری ناراضی کا خطرہ مول لیں گے۔ یہ قرب و معرفت کے اس بلند مقام پر فائز ہیں جہاں اس ڈھب کی لغزش کے معنی شدید ترین سزا کے مستوجب ہونے کے ہیں۔ یہ شاعرانہ تعلی نہیں کہ اس پر توجہ نہ دی جائے، نہ ہی کاہنوں اور رمالوں کی تک بندیاں ہیں کہ درخور اعتنا نہ ہوں۔ یہ تو اللہ کی طرف سے اترا ہوا کلام ہے جس میں آمیزش و تحریف کے اختیارات نبی کو ہرگز نہیں۔ اس لئے تم جو اس امید اور آس پر تکیہ کئے بیٹھے ہو ایک نہ ایک دن یہ تمہارے ڈھب پر آ ہی جائیں گے اور توحید و رسالت کی نکھری ہوئی دعوت کو شرک و بت پرستی سے ملوث کر دیں گے تو یہ ناممکن ہے کیونکہ ہمارے ہاں نبوت کی ان بلندیوں پر متمکن ہو کر پھسلنے اور گرنے کی سزا بڑی ہولناک ہے۔ اگر ایسا محال، ممکن کا لباس پہن بھی لے یعنی ہمارا فرستادہ ہو کر ہم ہی پر افترا کرنے لگیں تو پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ زندگی کے بار ہی سے سبکدوش

ہو جائیں اور کوئی تدبیر ان کو اللہ کی گرفت سے نہ بچا سکے۔

سزا سے متعلق اللہ تعالیٰ کی یہ عام سنت ہے کہ وہ ڈھیل دیتا ہے اور مجرم کو موقع عطا فرماتا ہے کہ موت سے پہلے پہلے اپنی حرکتوں پر نادم و منفعل ہو سکے اور اس کے بابِ اجابت پر دستک دے سکے یا پھر اس کی سرکشی حد سے بڑھ جائے اور گناہ اسے چاروں طرف سے گھیر لیں تا کہ قیامت کے دن جہنم کے عذاب سے دوچار ہو سکے۔ بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (البقرہ: ٨١)

''ہاں! جس نے برائی کی اور برائیوں نے اس کا احاطہ کر لیا تو بلاشبہ ایسے لوگ آگ کا ایندھن بنیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

اللہ کی اس سنت میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔
اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ○ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (النحل:١١٦، ١١٧)

یقیناً جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں کامیاب نہیں ہونے کے ان کی قسمت میں دنیا کی چند روزہ بہرہ مندی تو لکھی ہے لیکن آخرت میں دردناک عذاب ہے''۔

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ○ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ○ (یونس ٦٩:٧٠)

''کہہ دیجئے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ فلاح (''نجات اخروی'' براہین احمدیہ صفحہ 483) نہیں پانے کے، چند روزہ دنیا میں کھا پی لیں۔ پھر انہیں ہماری طرف لوٹ پلٹ کر آنا ہے۔ پھر ہم انہیں ان کے کفر کا شدید عذاب کی

صورت میں مزا چکھائیں گے"۔

چونکہ جھوٹی نبوت بھی بہر آئنہ ایک گناہ ہی تو ہے لہٰذا اس کے بارے میں بھی ڈھیل اور تاخیر کی سنت رہنی چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں یہ سختی کہ تمہاری جانب سے ذرا بھی اگر کذب وافتراء کا ظہور ہوا تو گردن ماردی جائے گی۔ اس لئے ہے کہ ان کے مقام کی بلندی اور ان کے درجہ کی رفعت، اس ڈھنگ کی بغاوت کی قطعی متحمل نہیں۔ کیونکہ جھوٹے، دنیا کے طالب اور مفسدو متفنی اگر جھوٹ بولتے اور جھک مارتے ہیں تو انہیں ایسا کرنا ہی چاہئے، لیکن اللہ کے راست بازوں کو اس کی اجازت نہیں جس طرح ان کا رتبہ بلند ہے، ان کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں، اسی نسبت سے ان کی سزا بھی دوگنی ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ○ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ○ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ○ (بنی اسرآئیل ۷۳،۷۴،۷۵)

"یہ لوگ وحی کے تقاضوں سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی تمہیں ہٹانے لگے تھے تاکہ ہم پر افتراء کرو اور اگر تم ایسا کر گزرتے تو یہ تمہیں یقیناً اپنا یار غار بنا لیتے اور اگر ہم نے تمہیں پیغمبرانہ ثبات نہ بخشا ہوتا تو تم ان کی طرف قدرے جھک ہی گئے تھے۔ اور اگر یہ ہو جاتا تو پھر جینے اور مرنے کی دوہری دوہری سزائیں ہم تمہیں چکھاتے اور ہمارے مقابلہ میں تمہارا کوئی حامی ومددگار بھی تو نہ ہوتا"۔

یہ رتبہ کی بلندی ہی تو ہے کہ ان حضرات سے بسا اوقات ترک اولیٰ پر بھی

پرسش ہوتی ہے۔ حالانکہ امت کو اس کا مکلّف نہیں بنایا گیا کیونکہ ان کی ہمت سے یہ توقع ہے کہ یہ اولیٰ سے اولیٰ تر کی طرف بڑھتے رہیں گے اور مباحات کے سامنے سپر ڈال کر بیٹھ جائیں گے۔ یہی معنی ہے اس عارفانہ قول کے کہ ''حسنات العوام سیئات الابرار'' کہ ''عوام کی نیکیاں ابرار و صلحاء کے لئے بمنزلہ سیئات کے ہیں اور یہی نکتہ لطیف مضمر ہے۔ سورہ فتح کی ابتدائی آیتوں میں کہ مژدۂ فتح سناتے ہوئے اس کی صراحت بھی کر دی کہ فتح سے پہلے زندگی اس زندگی کے مقابلہ میں بمنزلہ لغزش کے ہے اور ہم نے کامیابی کی یہ خوشخبری تمہیں اس لئے سنائی ہے کہ ان لغزشوں کو فتح مبین کے بعد بخشش و غفران سے بدل دیا جائے۔

لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح:۲)

مرقومہ بالا آیت کا یہ مطلب تو ایسا اچھا ہوا اور معقول ہے جو سب کو متاثر کرے گا۔ اب قادیانی بدمذاقی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے تقول کے معنی میں عموم پیدا کیا اور کہا کہ اس سے مراد جھوٹا نبی ہے۔ پھر جب یہ دیکھا کہ جھوٹا نبی بھی زندہ رہتا ہے اور خدا کی دی ہوئی ڈھیل سے فائدہ اٹھاتا ہے تو محض اس اتفاق سے کہ آنحضرت ﷺ نے برابر 23 سال تک اللہ کی دعوت کو لوگوں تک پہنچایا ہے یہ استدلال کیا کہ جھوٹا نبی 23 سال تک جھوٹ نہیں بول سکتا۔ غور فرمایئے اس میں کہاں تک معقولیت ہے۔ کیا 22 سال تک تو اللہ کی غیرت جھوٹ برداشت کرتی ہے لیکن اس کے بعد اس کا تحمل اس کو گوارا نہیں کرتا۔ پھر اس عرصے میں جو جھوٹ کو قبول کریں گے اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ سزا جھوٹی نبوت ہی سے خاص کیوں ہے، جھوٹے اور غلط مادی نظامِ حیات سے کیوں اس کا تعلق نہیں؟ اگر جھوٹا نبی فتنہ و فساد کا موجب ہو سکتا ہے تو غلط مادی نظام کے پھیلانے والے اور اپنی خداوندی کی

چوکھٹ پر بندوں کو جھکانے والے اور گمراہ کرنے والے تو کہیں زیادہ مفسد ہیں۔ پھر ان کی یہ سزا کیوں نہ ہو، جھوٹا اور غلط نظامِ حیات 23 برس تک کیوں زندہ رہے۔ قادیانی منطق کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

پیشین گوئی کا پنجرہ

معجزہ اور پیشین گوئی ایک ہی حقیقت کے دو ظہور ہیں' معجزہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تکوینیات میں لگے بندھے قوانین کی زنجیریں ٹوٹتی ہیں اور کوئی سائنسی طریق اس کی توجیہ نہیں کرپاتا اسی طرح پیشین گوئی سے علم کے نپے تلے قواعد کی مخالفت ہوتی ہے اور علم و خبر کے معمولی اور عامہ الورود ڈھنگ سے اس کی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ شق القمر مثلاً معجزہ اور خرق عادت ہے اس پر اگر صرف سائنس کے نقطہ نظر سے غور کیجئے گا تو یہ قطعی محال نظر آئے گا کہ اتنے بڑے کرے کے دو ٹکڑے ہو جائیں اور نظام شمسی میں کوئی ہلچل نہ ہو' یعنی تجاذب و کشش کے تمام دائرے جن کے بل بوتے پر نجوم و کواکب کا یہ حیرت انگیز نظم و نسق چل رہا ہے بغیر کسی ادنیٰ تاثر اور گڑ بڑ کے قائم رہیں۔ یعنی نہ تو چاند کے چہرے پر اس کا کوئی اثر ہو اور نہ سورج کی پیشانی پر شکن آئے۔ انسانی عقل اسے کب مانتی ہے اور عقل انسانی کی بساط ہی کیا ہے؟ یہ بیچاری تو ماننا بھی چاہے تو نہیں مان سکتی۔ ٹھیک اسی طرح پیشین گوئی بھی خرق عادت ہے جس طرح معجزہ دلائل نبوت میں سے ہے' اسی طرح اس کا شمار بھی نبوت کے دلائل و براہین ہی میں ہو گا' اس کا ڈھنگ بھی ایسا ہے کہ انسانی ذرائع علم و خبر سے اس کی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ غلبہ روم کی پیشین گوئی ہی کو لیجئے اور اپنے طور پر غور فرمایئے کہ ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان خوفناک جنگ ہے' دونوں قومیں

اپنے زمانے کی بڑی اور تاریخی قومیں ہیں' دونوں کے ذرائع بے پناہ اور وسیع ہیں اور دونوں حرب و قتال کی خوگر اور مشتاق ہیں۔ ان دو منجھی ہوئی قوموں میں جب لڑائی ہو گی تو یہ ظاہر ہے کہ آسانی سے ایک قوم کو دوسری پر غلبہ حاصل نہیں ہو سکے گا اور پھر اگر ان میں ایک کو شکست ہو ہی گئی تو پھر چند ہی سال میں اس کا خم ٹھونک کر میدان جنگ میں دوبارہ کود پڑنا اور شکست کو فتح سے بدل دینا اور بھی مستبعد ہے۔

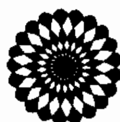
اس کو جانے دیجئے! سوچنے کی بات یہ ہے کہ سات سال پہلے قرآن کا متعین الفاظ میں فیصلہ سنا دینا کہ ایرانیوں کی اس عارضی فتح کا کوئی اعتبار نہیں رومی ہی آخر کار جنگ جیتیں گے کتنی بڑی بات ہے۔ پیشین گوئی اتنی واضح اور متعین ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ قریش سے شرط باندھتے ہیں اور مکے کی گلیوں میں پکار پکار کر رومیوں کی فتح کا اعلان کرتے پھرتے ہیں۔ کیا انسانی ذرائع علم و خبر سات سال پہلے کی ایک بات کو اتنے وثوق' اتنی قطعیت اور حتمیت سے بیان کرنے پر قادر ہیں؟ پیشین گوئی کی ایک صورت بلاشبہ یہ ہے کہ ایک شخص حالات و افکار کی نبض پر ہاتھ رکھے اور پھر اس کی چال سے آئندہ کا اندازہ کرے جیسے ہائینے نے ہیگل کے تصورات سے اندازہ کیا کہ آئندہ جرمنی کی سیاسی قسمت فسطائیت اور مطلق العنانی کا رخ اختیار کرے گی کیونکہ ہیگل کے فلسفہ میں اس کے جراثیم پہلے سے موجود تھے جس کو اس کی بصیرت نے ازراہ فراست بھانپ لیا۔ یہ پیشینگوئی حیرت انگیز ضرور ہے لیکن ایسی نہیں کہ اس کی علمی توجیہہ نہ ہو سکے۔ بلکہ اس کا تو کمال ہی یہ ہے کہ یہ ٹھیک ٹھیک اندازے اور تخمینے پر مبنی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیاں ان علمی اندازوں سے قطعی مختلف ہوتی ہیں' یہاں آئندہ واقعات سے متعلق ایسی حقیقتوں کا انکشاف ہوتا ہے جن کی تہہ میں تجربہ و تخمین کا کوئی اصول کارفرما نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیاں خرق عادت یا معجزانہ خصوصیات کی حامل اسی وقت ہوں گی جب وہ واضح اور متعین ہوں اور انسانی وسائل علمی اپنے کو ان کی توجیہ سے قاصر و عاجز قرار دیں ورنہ وہ اٹکل سے کہی ہوئی ایک بات ہیں جو ہو سکتا ہے غلط ہو اور ہو سکتا ہے کہ صحیح ہو یا وہ ایسی بے تکی اور مہمل شے ہے کہ اس کے کچھ معنی ہی مقرر نہیں۔ پیشین گوئی اور اس قسم کی مہملات میں ایک اور فرق یہ ہے کہ پیش گوئی کا پہلے سے چرچا ہوتا ہے پھر جب واقعات سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے تو ایمان و آگہی میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا ہے جیسا غلبہ روم کی پیش گوئی پر ہوا کہ جب رومی ساتویں سال جیت گئے تو مسلمانوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور مہملات توجہ و التفات کو ذرہ بھی متاثر نہیں کرپاتے بلکہ ان کو اس وقت استعمال کیا جاتا ہے اور ان میں اس وقت معنی ڈالا جاتا ہے جب بے خبری میں ایک واقع ہو جاتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قادیانیوں میں مرزا صاحب کی ایک پیشین گوئی کا بڑا اہتمام ہے اس کی سندات ڈھونڈھ ڈھونڈ کر نکالی جا رہی ہیں اور اس کے اہمال اور بے تکے پن کو بڑی عیاری سے دور کیا جا رہا ہے۔ مرزا صاحب کا ایک الہام ہے "داغ ہجرت" اس کو موجودہ انقلاب پر چسپاں کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مرزائیوں نے سوچا ہو گا کہ اتنی بڑی تبدیلی سے متعلق اگر مرزا صاحب کا کوئی الہام ان کی کتابوں میں سے نہ نکلا تو بڑی بھد ہوگی لوگ

کہیں گے کہ عجیب نبی ہے جو محمدی بیگم کے نکاح کا ڈھنڈورا تو چار دانگ عالم میں پیٹتا ہے مگر ملک کے اس عظیم الشان بٹوارے کے متعلق کچھ نہیں جانتا جس کی وجہ سے ان کی امت کو بنے بنائے مرکز ہی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ تلاش اور تفحص سے معلوم ہوا کہ الہام ''داغ ہجرت'' ہے جس کی تاویل ہو سکتی ہے۔

اب غور فرمایئے پیشینگوئی جن معنوں میں خرق عادت اور غیر معمولی حقیقت ہوتی ہے اس کی کوئی جھلک بھی اس میں پائی جاتی ہے پہلے یہ تو بتایئے کہ نحو کی اصطلاح میں یہ کوئی جملہ بھی ہے جس سے سننے والے کے علم میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ یہ خبر ہے؟ انشاء ہے؟ کیا ہے؟ یہ داغ ہجرت کیسا ہے؟ کون اٹھائے گا؟ کب اٹھائے گا؟ مومنوں اور عقید تمندوں کو یہ زحمت گوارا کرنا پڑے گی یا دشمن اسے برداشت کریں گے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اور اس میں پیشین گوئی کی کون سی ادا پنہاں ہے؟ اگر ہر بے تکی بات ہر مہمل جملہ اور ہر خرافات کی قسم کی چیز پیشین گوئی ہو سکتی ہے تو پھر خود بے تکے پن' اہمال اور خرافات کے لئے ہمیں اور معنی تلاش کرنے پڑیں گے۔



خلافت مرزائیہ

- خلیفہ معزول ہوسکتا ہے یا نہیں؟
- خلیفہ کی حیثیت
- خلافت راشدہ
- فہم مسائل کا قانون
- شریعت اور خلافت
- مرزائی نکتہ نظر
- خلیفہ کی شرعی حیثیت
- مرزائی طرز استدلال فریب کاری

کیا خلیفہ معزول ہوسکتا ہے؟

انتہائی اہم اور اصولی بحث

کیا خلیفہ معزول ہوسکتا ہے

''الفضل'' میں کئی ہفتوں سے یہ بحث چل رہی تھی کہ خلیفہ یا امیر جب ایک مرتبہ منتخب ہو کر مسندِ سیادت پر فائز ہو جائے تو پھر معزول نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کے نصب و قیام میں جہاں امت کے حقوق و اختیار کا تعلق ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی کارفرمائیوں کو بھی دخل ہے۔ اس موضوع پر اظہار خیال سے پہلے ہمیں ان حضرات سے پوچھنا ہے کہ آپ کے حلقوں میں اس پر بحث کی ضرورت آخر کیوں محسوس ہوئی۔ جب کہ آپ کے ہاں خلافت کا جو تصور ہے وہ اس خلافت سے بالکل مختلف ہے جس کے قیام و نصب پر مسلمان اسی طرح مکلّف ہیں جس طرح دوسرے امورِ دینی پر، آپ کی خلافت اس نبوت کی یادگار ہے جس نے انگریز کی مستعمرانہ دسیسہ کاریوں کو استواری بخشی بلکہ جو معرضِ ظہور میں آئی ہی اس لئے تھی کہ انگریز کے خلاف جو جذبات مسلمانوں میں موجزن تھے اور نئی نئی تحریکیں ابھر رہی تھیں۔ ان کو موت کے گھاٹ اتارا جائے۔ یہ خلافت اس نبوت کی قطعی قائم مقام نہیں ہوسکتی جو عدل و ہدایت کے نظامِ اجتماعی کو قائم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے اور جو اس نصب العین کی تکمیل کے لئے بخشی جاتی ہے کہ انسانی معاشرہ کو بہترین اور متوازن اقدارِ حیات پر مبنی ٹھہرایا جائے۔ آپ کے ہاں چونکہ نبوت کا تصور یہ ہے کہ کوئی انقلابی قسم کی چیز نہیں ہوتی بلکہ غلامی و خیمہ برداری کی ڈھب کی خدمات بھی اسی سے لی جاسکتی ہیں اور انگریز کے مشئوم عزائم کی وہ آلہ کار بھی ہوسکتی ہے۔ اس

لئے خلافت بھی ایسی ہوسکتی ہے کہ جو دینی انداز کی پاپائیت ہو۔ جو جمہور کے اعتماد کے بجائے کشوف و رؤیا ہائے قلموں کے بل پر اپنا کاروبار چلا رہی ہو اور جس کا مصرف صرف یہ ہو کہ وہ اپنے خاندان کے لئے جاگیریں خریدے، اپنے بیٹوں کو ''ہوالناصر'' کہہ کر آگے بڑھائے اور چندوں کا ایک جال جو ایک مرتبہ بچھ گیا ہے اسے بحر آئنہ قائم و برقرار رکھے۔ اس نوع کی بحثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزائی حلقوں میں خلیفہ صاحب کے خلاف ''اچھی خاصی'' اپوزیشن پیدا ہو رہی ہے اور کچھ لوگ سنجیدگی سے چاہ رہے ہیں کہ میاں محمود اس منصب سے دست بردار ہو جائیں اور کسی بہتر اور موزوں مرزائی کے لئے جگہ خالہ کر دیں۔

خلیفہ معزول ہوسکتا ہے یا نہیں؟

یہ ایک علمی بحث ہے اور اس میں اس وقت تک اختلاف رائے کی گنجائش ہے جب تک خلافت و امارت کے تصور کو تعبدیات کے اثرات سے الگ کر کے نہ دیکھا جائے۔ اگر خلافت کا مسئلہ اس ڈھب کا ہے کہ اس میں جمہور یا اربابِ حل وعقد کی رائے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں اور نبوت کی طرح اس کی تعیین و اقامت بھی اللہ تعالیٰ کے ارادے اور انتخاب سے ہو پاتی ہے تب یقیناً اس کا عزل غلط اور ناجائز ہے اور اگر خلیفہ کے نصب و قیام کا حکم آسمان سے نازل نہیں ہوتا بلکہ مسلمانوں کی رائے اور انتخاب سے اسی زمین پر یہ مسند امارت پر بیٹھنا اور زمام قیادت سنبھالنا ہے، تب رائے اور اتفاق سے اس مسند سے ہٹایا بھی جاسکتا ہے۔ یعنی جب خلافت کا قیام مشورے سے ہوتا ہے تو یہی مشورہ اس کے عزل کا بھی موجب ہوسکتا ہے۔ یہ بالکل سادہ سی حقیقت ہے جسے ''الفضل'' نے خواہ مخواہ الجھا دیا ہے کہ جو ہاتھ عمارت کے

بنانے میں کام آسکتے ہیں وہی ہاتھ اس کو گرادینے پر بھی قادر ہیں۔

اسلام وعدل وانصاف کا علمبردار ہے اس لئے وہ یہ نہیں مان سکتا کہ کوئی حکومت یا امارت مسلمانوں پر اس طرح مسلط ومسیطر ہوسکتی ہے کہ اس کو ہٹا دینا ناممکن ہو۔ کیونکہ اس کے منطقی نتائج یہ ہوں گے کہ ہم عصمتِ خلافت کے قائل ہوں اور یہ تسلیم کرلیں کہ جس انسان کو ہم خلافت کے لئے منتخب کرتے ہیں، اس میں محض اس انتخاب سے اور مجردِ مسندِ اقتدار پر فائز ہونے سے ملکوتی قوتیں پیدا ہوجاتی ہیں اور وہ کبھی بھی غلطی نہیں کرسکتا۔

کیا اس دور میں اس نوع کے سیاسی الجھاووں کے لئے کوئی گنجائش ہے؟ خلیفہ اگر انسان ہے اور اس میں انسانی کمزوریاں موجود ہیں تو وہ بلاشبہ مسلمانوں کو ایسی راہ پر چلا سکتا ہے۔ جو ہلاکت وگمراہی کی راہ ہو اور اس طرح بہک سکتا اور غداری کرسکتا ہے کہ اگر اس کا ہاتھ نہ روکا جائے اس کے خلاف بغاوت نہ کی جائے اور اس کو اس منصب سے ہٹایا نہ جائے تو عظیم قومی خساروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہ بات جتنی دینی ہے اتنی ہی عام سمجھ بوجھ کی ہے۔ مرزائی دوست غور فرمائیں کہ نبوت کے بعد کسی شخص کی رائے کو منزہ عن الخطاء قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور یہ مانا جاسکتا ہے کہ اس سے سیاسی ودینی غلطی کا ارتکاب نہیں ہوسکتا۔

خلیفہ کی حیثیت

یہ بحث کہ خلیفہ معزول ہوسکتا ہے یا نہیں یا بادشاہ کے سامنے قوت واقتدار کی بے پناہ طاقتوں کو صحیح معنوں میں استعمال کرنے کا مسئلہ بھی ہے یا نہیں۔ ایک پرانی بحث ہے جس پر ہمارے ہاں متکلمین وفقہاء کے ہاں ہی بحث نہیں ہوئی یورپ نے بھی

مدتوں اس کو استخوان نزاع ٹھہرایا ہے اور ان میں باقاعدہ دو گروہ ہو گئے ہیں ایک گروہ حکماء وسیاسیین کا ایسا ہے جو خلافت واقتدار کو ایک طرح کی آسمانی اور مقدس شے قرار دیتا ہے، یہ نہیں مانتا کہ اس میں کسی طرح کا ردوبدل عوام کی مرضی اور جمہور کی منشاء کے مطابق ہو سکتا ہے۔ اس گروپ کے لیڈر مشہور فلسفی ہابز ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی میں ان کے افکار کی اشاعت ہوئی۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو بادشاہت و اقتدار کے دائروں کو آسمان تک پھیلا ہوا نہیں سمجھتا۔ اس کی رائے یہ ہے کہ یہ قوت وطاقت جس سے بادشاہ بہرہ مند ہوتا ہے۔ اس لئے عوام و جمہور کی مرضی سے اس کو چیلنج کرنا ممکن ہے۔ ان خیالات کی ترجمانی سترھویں صدی عیسوی میں جان لاک نے کی اور اسی سے حکمرانی وسلطانی کا سحر اس طرح دور ہوا کہ اب کوئی پڑھا لکھا شخص بھی اس کا قائل نہیں کہ حکومت و اقتدار کے عزل وقیام میں عوام کی مرضی کو کوئی دخل نہیں۔ ہمارے ہاں یہ تصور کہ خلافت انتخابی و جمہوری انداز کا مسئلہ نہیں دو جہتوں سے آیا ہے۔ ایک تو شیعی مدرسہ فکر نے اس کی اشاعت کی ہے کیونکہ یہ گروہ اگر انتخاب وشوریٰ کو خلافت کی بنیاد ٹھہراتا ہے تو اس کی پوری آئیڈیالوجی ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان لوگوں نے عمداً خلافت کو اس ڈھب سے پیش کیا کہ یہ بھی کوئی نبوت قسم کی چیز ہے جس میں انسانی معیاروں کا خیال نہیں رکھا جاتا اور محض بخشش اور محبت سے اس کا ظہور ہوتا ہے۔

دوسری سمت ملوکیت اور اس کے شعراء کی ہے جب خلافت کے بعد نیابت و اختیار کی زمام جابر و قاہر بادشاہوں کے ہاتھوں میں آئی تو شعراء و مصنفین نے انہیں انعام و خلعت کے لالچ میں ظل اللہ، ظل سبحانی اور اس انداز کے القاب سے مخاطب کرنا شروع کر دیا جس سے بجا طور پر یہ شبہ ابھر سکتا تھا کہ ان لوگوں کو یہ اختیارات محض اللہ کی عنایت و بخشش سے ملے ہیں اور ان اختیارات کو مجروح کرنا خود اسلام کو مجروح

کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ اسلامی ادب و تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کیجئے تو متعدد مثالیں اس کی ملیں گی۔ ایک شاعر نے کھلے بندوں اپنے ممدوح کے بارے میں کہا:-

ولقد اراد الله از ولا کہا   من امة اصلا حها و رشادها

کہ اللہ تعالیٰ نے جب تمہیں خلیفہ ٹھہرایا اور مقرر کیا تو اس میں امت کی اصلاح و رشاد کی مصلحتیں پنہاں تھیں۔

خوشامد و تعریف کے تقاضے اس حد پر رکے نہیں بلکہ ایک بد بخت نے بادشاہ کو تو بالکل خدا ہی بنا ڈالا "ما شئت لا ماشاء ت الا اقدار فاحکم فانت الواحد القہار" (جو کچھ تو چاہے گا وہی ہوگا۔ قضاؤ قدر کے ارادے نہیں چلنے کے۔ پس تو حکم دے کیونکہ تو ہی واحد و قہار ہے۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بایں جلالتِ قدر ایک منطق کی کتاب پر حاشیہ لکھتے ہوئے رقم فرمایا: جعلته عراضته لحضرة من خص الله تعالىٰ بالسلطة الا بدية وايده الله بالدولة السرمدية ..... الخ (میں اس کو بادشاہ کے حضور پیش کرتا ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے ابدی سلطنت سے نوازا ہے اور دولتِ سرمدی سے مالا مال کیا ہے) مصنفین و شعراء کی یہ عام اور بیسیوں کتابوں سے اس نوع کی عبارتیں نقل کی جا سکتی ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ اندازِ بیاں اس مجاز کا بھی حامل ہے جس کا حق ایک ادیب اور شاعر کو دینا چاہئے۔ اور اس سے کوئی علمی مسئلہ مستنبط نہیں ہوتا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس اندازِ بیان سے غیر شعوری طور پر یہ عقیدہ ذہنوں میں پیدا ہوا کہ بادشاہ کے اختیارات براہ راست خدا کے بخشے ہوئے ہیں۔

خلافتِ راشدہ

نفسِ مسئلہ کی چھان بین کے لئے ان دونوں سمتوں سے الگ ہو کر ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ منصبِ خلافت کی حقیقت کیا ہے۔ کیا یہ نبوت کی طرح براہ راست اللہ تعالیٰ کے انتخاب واصطفاء سے متعلق ہے یا اس کی تشکیل جمہور مسلمان کرتے ہیں اور یہ ایسا منصب ہے جس سے دینی وثقافتی اقدار وابستہ ہیں۔ زیادہ تفصیلی بحث کی ان صفحات میں گنجائش نہیں اس پر غور فرمایئے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب خلیفۃ اللہ کہا گیا تو انہوں نے صاف صاف فرمایا لست خلیفة الله و لکنی خلیفة الرسول الله ''میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ ہوں'' اس سے معلوم ہوا کہ خلافت کی طاقت کا سرچشمہ ومنبع اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہے بلکہ وہ ایک فریضہ ہے جو آنحضرت ﷺ کے بعد امت پر، امت کی مرضی سے عائد ہوتا ہے اور دوسرے فرائضِ دینی کی طرح اس میں دونوں طرح کے احتمال ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شخص اس کے تقاضوں کو کما حقہ سمجھے اور بہتر طریقہ سے انجام دے اور یہ کہ بہتر طریق سے انجام نہ دے اور اس میں تبدیلی وتغیر کی ضرورتوں کا احساس ہو۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مسئلہ خلافت میں صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف رائے ہوا اور اس اختلاف رائے نے آخرِ کار خلافتِ راشدہ کی طرح ڈالی اور ایک مثالی حکومت دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کی۔ اب اگر خلافت کا مسئلہ انسانی اختیار کا مسئلہ نہیں تھا اور خلیفہ اسلام کا قیام بطریق انتخاب[1] نہیں ہو سکتا تھا تو پھر اس اختلاف رائے کی کیا توجیہ کی جائے گی۔

تاریخ اسلام کا ادنیٰ طالب علم بھی اس پیش پا افتادہ بات کو جانتا ہے کہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب معرضِ ظہور میں آیا۔ یہاں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہوئی جس سے یہ شبہ تک ابھر سکے کہ خلافت ایسا حق ہے کہ جس کا تعین و تحقق سراسر اللہ کی مرضی پر منحصر ہے اور عام ارادوں اور مرضی کا اس بارے میں لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ کیونکہ اگر مسئلہ کی یہ نوعیت نہ ہوتی تو اسلامی تاریخ کے ابواب اس ڈھب سے نہ لکھے جاتے اور اس ڈھنگ کے جھگڑوں کا اس میں نشان نہ ملتا۔ اب سوچنے کی چیز یہ ہے کہ جو بات اہل الرائے کی مرضی سے اتمام و تکمیل کی منزلیں طے کرتی ہے وہ ان کے احتساب سے دوسرا قالب اور سانچہ کیوں اختیار نہیں کرسکتی جس اقتدار کو یہ جنم دیتے ہیں اس اقتدار کو چھین کیوں نہیں سکتے؟ اور جب خلیفہ کو یہ تقدیس خدا نے نہیں بخشی ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے عطا کی ہے اور جمہور بھی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی ذات میں اختیار و اقتدار کو اس انداز سے نہیں مانتے کہ اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہوسکے تو یہ ''اقتدار مطلق'' آتا کہاں سے ہے؟

فہم مسائل کا قانون

ہر مسئلہ کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر غور و فکر کرتے وقت ہمیں کس طرح کے ذرائع سے کام لینا ہے۔ جو چیز تولنے کی ہے اس کا وزن تول ہی سے معلوم ہوسکے گا اور جو سونگھنے کی اور دیکھنے کی ہے اس میں قیاس آرائی اور اٹکل سے کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ طبی مسائل کے حل کے لئے جغرافیائی معیاروں سے استمداد نہیں کی جائے گی اور جغرافیہ کی سچائیوں میں فلسفہ و حکمت کا قانون چلنے والا نہیں۔ محسوسات کو محسوسات کے عالم میں رکھا جائے گا اور قیاسات و افکار کے لئے فکر و عقل ہی کی دنیا موزوں رہے گی۔

فہمِ مسائل کا یہ اتنا جچا تلا اور فطری قانون ہے کہ اگر اس کا خیال نہ رکھا جائے اور ہر مسئلہ کی ایک جگہ اور مقام متعین نہ کیا جائے اور اس کی چھان بین اور تحقیق وتفحص کے دائروں کی نشاندہی نہ کی جائے تو عجیب وغریب اور مضحکہ خیز غلطیاں سرزد ہوں گی۔ جو چیز تولنے کی ہے اس کا اندازہ قوت شامہ سے نہیں ہوسکتا اور جو حقیقت دیکھ کر محسوس کر کے بتانے کی ہے اسے سوچ سمجھ اور غور وفکر کی صلاحیتیں حل نہیں کر سکتیں۔ امراض و علاج کی بحثوں کے لئے طب کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جغرافیائی تحقیقات کے لئے انہی چیزوں سے مدد لی جائے گی جن کا لگاؤ جغرافیہ سے ہے۔ اسی طرح فلسفہ کی ایک دنیا ہے اور اس کے مسائل ہیں۔ جو فلسفہ ہی کی زبان میں بیان ہوسکتے ہیں۔ ان کے لئے ایسا پیرایہ بیان اور انداز غلط فہمیوں کا موجب ہوسکتا ہے جس کو اس غرض کیلئے وضع نہیں کیا گیا یونانیوں نے ایک ہمہ گیر اور عظیم غلطی یہ کی کہ ہر ہر مسئلہ کو میٹا فزکس کی عینک سے دیکھا حالانکہ یہ نقطہ نظر عقلی مباحث کے لئے موزوں ہوسکتا تھا چنانچہ انہوں نے جب طب پر بحث کی تو اس کی روشنی میں ہیئت و نجوم کی گتھیوں کو سلجھایا تو اس زاویہ نظر سے اور ٹھوس مادی مسائل پر گفتگو کی تو اس لب و لہجہ اور زبان میں جو صرف مابعد الطبعی فنون کے لئے مخصوص تھی مثلاً ستاروں کی چال اور افلاک کی حرکت سے متعلق ایک عامۃ الورود سوال یہ تھا کہ اس کی نوعیت کیا ہے کیا وہ ہمیشہ ایک دائرے میں ہوتی ہے یا دائرے میں نہیں ہوتی؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب صرف مشاہدہ ہی دے سکتا تھا لیکن انہوں نے مشاہدہ غیر ضروری ٹھہراتے ہوئے ایک دلیل گھڑی کہ چونکہ دائرہ میں حرکت کرنا حرکت کا کامل ترین تصور ہے اور فلک کی حرکت کامل ترین حرکت ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ یہ دائرے میں ہو۔ جب تک بڑی بڑی دوربینیں معرضِ وجود میں نہیں آئی تھیں اور عظیم الشان

رصدگاہیں قائم نہیں ہوئی تھیں اور کچھ دوسرے ذرائع سے حقیقت کا اتا پتہ نہیں ملتا تھا اس کو مانا گیا لیکن جونہی فلکیات کی تحقیق نے تجربہ کی روشنی میں یقینی قدم اٹھائے اس میٹا فزکس کی تردید ہوگئی اور معلوم ہوا کہ مختلف ستاروں کی حرکت کا انداز مختلف ہے۔ تشریح الابدان و وظائف اعضاء سے متعلق عجیب عجیب رائیں قائم کی گئیں اور محض قیاس ورائے کے بل بوتے پر جسمِ انسانی کا ایک نقشہ بنایا گیا جس کی بعد میں تردید ہو گئی۔ مادے کی تقسیم کے بارے میں اجزاء تجیزی کا نظریہ قائم کیا گیا کیونکہ ذہن فی الواقع یہی چاہتا ہے کہ تقسیم کے بعد تقسیم کا کام جاری رہے حالانکہ موجودہ سائنس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ تجزی و تقسیم پر ایک منزل ایسی آتی ہے جب یہ ختم ہو جاتی ہے اور مادہ کہربائی نقطوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں رہتا۔ یونانی علوم کے ترجموں سے یہ بدعت و بدمذاقی ہمارے ہاں بھی آئی اور ہم نے بھی مسائل پر اس انداز سے سوچنا شروع کیا کہ ان کی اصلی سرحدوں کو باہم خلط ملط کردیا۔ پانچویں منطق کی مشکلات پر قابو پانے کے لئے فلسفہ کی مدد چاہی گئی اور فلسفہ کو کلام کی روشنی میں دیکھا گیا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا کہ خواہ مخواہ الجھاؤ پیدا ہوا اور پیچیدگی بڑھی۔

شریعت اور خلافت

بالکل یہی صورتحال مسئلہ خلافت سے متعلق پیش آئی۔ یہ مسئلہ اپنے مزاج تفصیلات اور نتائج کے اعتبار سے خالص سیاسی نوعیت کا ہے۔ لیکن شریعت کو بہرحال اس سے اتنی دلچسپی ضرور ہے کہ اس نے جو اصول طے کردیئے ہیں ان پر عمل کیا جائے اور جو غرض و غایت حکومت و ریاست کی متعین کی ہے وہ بہر آئینہ ہیئت حاکمہ میں منعکس اور موجود رہے اور بس۔ یہ آلٰہیات سے متعلق نہیں اور تعبدیات سے وابستہ

نہیں مگر ہمارے علماء نے اس کو بھی ایک کلامی مسئلہ بنا دیا اور اس طرح اس کے سرے آلہیات وتصوف سے جاملائے کہ موجودہ سیاسی سائنس میں اس کی حقیقت متعین کرنا دشوار ہوگیا۔ بات صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں کا ایک آئینی سربراہ ہونا چاہئے اور اس کو وہ خدمت انجام دینا چاہئے جو اسلامی ریاست کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہے۔ اور جب وہ یہ خدمت انجام نہ دے سکے تو ''اربابِ حل وعقد'' ایسے آدمی کو آگے بڑھائیں جو اس خدمت کو زیادہ بہتر طریق سے ادا کر سکے۔

مرزائی نکتہ نظر

اس میں کون سی ایسی چیز ہے جو سمجھ میں آنے والی نہیں لیکن برا ہو خلطِ بحث اور بیہودگی کا کہ اس میں بھی وہی غیر معقولیت اختیار کی گئی اور اس پر بھی یوں غور ہونے لگا کہ گویا یہ کوئی ایسی عقیدہ کی بحث ہے جس پر عملی وسیاسی دنیا میں تجربہ نہیں ہوسکتا۔ یہ درست ہے کہ ایسی خلافت جس کے حدود کار چندہ کی تحصیل وصرف کے خانوں تک محدود ہوں۔ ایسی خطرناک نہیں ہوسکتی کہ اس کو ہٹانے کا سوال کبھی پیدا ہو۔ لیکن وہ خلافت جو بہت بڑی سیاسی طاقت ہو اور جس کے فیصلوں سے ایک ملت کی زندگی بچ سکتی یا معرضِ خطر میں پڑ سکتی ہو اس کو تنقید سے بالا سمجھنا اور خدا قرار دینا ایسی بے وقوفی ہے جس کی کبھی تلافی نہیں ہوسکتی۔

مرزائی مولوی فاضلوں کو شاید معلوم نہیں کہ ایک انسان جتنے بڑے اقتدار کا مالک ہوگا اسی نسبت سے وہ ظلم واستبداد کو منوانے کی زیادہ صلاحیتیں رکھے گا۔ خلیفہ کی ایک لغزش اور حکمران قیادت کی ملت کے خلاف ایک نداری صدیوں تک کے لئے مسلمانوں کے ایک گروہ کی زندگی کو خطرے میں ڈال سکتی ہے تو کیا اسلام ہمیں اس کی

اجازت نہیں دیتا کہ اس قوت کا جائزہ لیتے رہیں۔ ہمیں بتایا جائے کہ اختیار کی غیر محدود قوتوں کو پاکر ایک انسان آخر اتنا بے بس کیوں ہو جاتا ہے کہ اس سے کوئی لغزش کوئی غلطی اور کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔ کیا انسانی تاریخ سے اس کی کوئی مثال مل سکتی ہے کہ مجرد اختیارات کی بے پناہی سے کوئی شخص معصوم ہو گیا ہو اور جرائم پیشی کا ہر جذبہ اس میں دب گیا ہو۔

اس مسئلہ کو خالص سیاسی معیاروں سے دیکھئے کہ جس شخص کو مسلمانوں نے اپنے لئے خلیفہ چنا ہے اس کے بارے میں یہ یقین کب پیدا ہوا ہے کہ اس انتخاب کے بعد اس سے غلطی نہیں ہوگی اور اس کی نفسیاتی خواہشوں سے ملت کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ کبھی کسی آئینی سربراہ سے متعلق کسی قوم نے اس طرح کی رائے قائم کی ہے؟ یا اس طرح کی رائے قائم کرنے کے لئے کوئی سیاسی وجہ جواز ہے۔ قادیانی دوست سوچ سمجھ کر جواب دیں کہ ان کے نقطہ نظر سے کس طرح کی سیاسیات پیدا ہوتی ہیں اور حکومت کا کیا نقشہ ترتیب پاتا ہے اور کیا اس نقشہ کے ماتحت اس صدی میں کوئی حکومت چل سکتی ہے؟

خلیفہ کی شرعی حیثیت

فقہی حیثیت سے خلیفہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کا وکیل ہے۔ لہذا جب تک موکل یہ سمجھے گا کہ اس کا مقرر کردہ نائب اس کی ترجمانی کے حقوق ادا کر رہا ہے اس وقت تک وہ اس کو قائم رکھے گا اور جب یہ ثابت ہوگا کہ وکالت کی ذمہ داریوں کو وہ ٹھیک سے ادا نہیں کر رہا ہے تو اس کو اختیار ہوگا کہ اس سے وکالت و زعامت کی باگ چھین لے۔ اگر خلیفہ کی ٹھیک ٹھیک یہی فقہی حیثیت نہیں ہے اور اس کا

منصب کوئی دوسری فقہی شکل رکھتا ہے تو اس کی وضاحت ہونا چاہئے لیکن شرط یہ ہے کہ گفتگو فقہ و سیاست کی اصطلاحوں میں ہو اور اس کے دائروں میں رہے۔ قرامطہ کی زبان میں نہ ہو۔

سیاسیات کو چھوڑ کر دینی نقطۂ نظر سے اگر غور کیا جائے تو صرف یہ بات اس سلسلہ میں تنقیح طلب رہ جاتی ہے کہ خلیفہ میں تقدیس کہاں سے آتی ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن و حدیث میں کہیں یہ فرمایا ہے کہ تم جس شخص کو اپنے ناقص علم کی بناء پر ایک دفعہ خلیفہ چن لیتے ہو میں اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لغزش و خطا کے امکانات چھین لیتا ہوں۔ یا یہ قصہ ہے کہ جمہور مسلمان ووٹ اور رائے کے ساتھ ساتھ تقدیس کی کوئی مقدار بھی خلیفہ کو دیتے ہیں جو جمع ہو کر ایسی ہو جاتی ہے کہ گناہ کے تقاضوں پر غالب آ جائے۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ مسئلہ خلافت اور اس کا نصب و قیام خالص سیاسی مسئلہ ہے اور فقہی مبحث ہے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ فقہ و سیاست کی زبان میں گفتگو کی جائے اور انہی دلائل سے کام لیا جائے جن کا کوئی تعلق عملی سیاست یا فقہی نکات سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اس اندازِ تحقیق کو چھوڑ کر تصوف و اسرار کا پیرایہء بیان اختیار کیا جائے تو لامحالہ اس تنقیح میں اور الجھاؤ پیدا ہوں گے۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ مرزائیت چونکہ تعبیر ہی ایک طرح کے انحراف سے ہے اور اس کے تمام دلائل میں اسی ٹیڑھ کو مبنیٰ و اساس ٹھرایا گیا ہے اس لئے یہ امید ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی مسئلہ پر اس اندازِ بیان کو چھوڑ سکتے ہیں اور ایسا اسلوب اختیار کر سکتے ہیں جو اس سلسلہ میں موزوں ہے۔

مرزائی طرزِ استدلال یا فریب کاری

مرزائیت کے بارے میں سارا رونا اسی بات کا ہے کہ اس سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ ایک گمراہی پھیلتی ہے یا ایک تاویل کی غلطی سرزد ہوتی ہے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے فکر و عقل کا پورا سانچہ ہی بگڑ جاتا ہے اور اس میں صحت و استواری کے لئے گنجائش ہی نہیں رہتی۔ چنانچہ یہ دیکھئے کہ مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری یہ مانتے ہیں کہ ''اہل سنت میں سے محققین کا یہ عقیدہ ہے کہ خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے تقرر میں ایک حد تک اہلِ ایمان کی آراء کا دخل ہوتا ہے مگر ان کے عزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ درحقیقت ان کا تقرر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ایک حد تک کی قید میں یہاں جو الجھاؤ مخفی ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں مگر زیادہ مضحکہ خیزی اس عبارت میں ہے جو ''مگر'' کے بعد ہے۔ کہ باوجود اس کے کہ خلیفہ کو مجلس شوریٰ چنتی ہے اور اس مفاہمت کی بناء پر چنتی ہے کہ خلیفۃ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے گا۔ اسلام کے نفاذ میں حتی الامکان کوشاں رہے گا اور کوئی بات ایسی نہیں کرے گا جس سے اسلام یا مسلمانوں کا وجود خطرہ میں پڑ سکے مگر جونہی کہ خلیفہ کا انعقاد ہو چکتا ہے اور تقرر معرض وجود میں آ جاتا ہے پھر احتساب و محاسبہ کی کوئی قوت ایسی نہیں رہتی جو خلیفہ کو اس مفاہمت و اقرار پر قائم رکھ سکے۔''

یہ طریقِ استدلال جس قدر عجیب ہے خود مولانا ابوالعطاء صاحب کو اس کا اعتراف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ منتخب ہونے کے بعد وہ انسانوں کی آراء کے تابع نہیں رہے گا یہ صورتِ حال بظاہر عجیب ہے۔ (بظاہر نہیں بلکہ حقیقتاً عجیب ہے) مگر ذرا غور کیا جائے تو یہ معقول اور درست معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں

فرمایا۔ وَعَدَاللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ (۵۵:النور) کہ ''مومنوں سے میں خلیفے بناؤں گا''۔ ''خلیفے بناؤں گا'' کے ترجمہ پرغور کیجئے کیا اس سے بڑی تحریف ترجمہ ومعنی میں ہوسکتی ہے؟ آیت کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ مسلمان اگر ایمان وعمل کے تقاضوں کو پورا کرتے رہیں گے تو اللہ تعالی کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ تمکن واستخلاف کی نعمتوں سے بہرہ مندرہیں گے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ بنے بنائے خلیفے مہیا کرے گا تحریف ہی نہیں افسوس ناک جہالت بھی ہے۔ اس دعویٰ کو اسرار کی زبان میں قادیانی مولانا یوں بیان فرماتے ہیں یقیناً نبی اور خلیفہ کے درجہ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ (یعنی نبی اللہ کے انتخاب سے ہوتا ہے اور خلیفہ کو ارباب حل وعقد منتخب کرتے ہیں) مگر جہاں تک نفسِ عقد ہے اس میں دونوں کا نصب العین ایک ہی ہوتا ہے۔ دونوں خدائے قدیر کے مظہر ہوتے ہیں۔'' ''نبی اگر پہلی قدرت ہے تو خلیفہ قدرتِ ثانیہ ہے۔''

قادیان کے تمام مولوی فاضل از راہِ کرم سوچ سمجھ کر بتائیں کہ دلیل کی یہ کون سی قسم ہے۔ یہاں اس عالمِ گونا گوں میں آخر کون سی چیز ایسی ہے جو براہ راست اس کی صفات تخلیق وربوبیت کا ظہور نہیں۔ پھر کیا ہر ہر چیز کی اصلاح اور تبدیلی ممنوع ہے۔ ہمیں مطلع کیا جائے کہ قدرتِ اولیٰ وثانیہ کی تقسیم سے مسئلہ زیر بحث پر کیا روشنی پڑتی ہے۔ جب تک قادیانی علم الکلام کے ترجمان کتاب وسنت کی کسی نص سے یہ ثابت نہیں کر دیتے کہ خلیفہ کا عزل ممنوع ہے یا پولیٹیکل سائنس کی اصطلاحوں میں اس کی افادیت کا یقین نہیں دلاتے نفسِ موضوع اپنی جگہ سے ہلنے والا نہیں۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ الفضل کے صفحات میں کوئی معقول دلیل ایسی مل جائے جن پر ان

کے دعویٰ کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ لے دے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے متعلق آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے الله تصمصک قمیصا فان ارادوک علی خلعه فلا تخلعه " اللہ تمہیں خلافت کی عبا پہنائے گا اس لئے اگر کچھ لوگ اسے اتروانے کی خواہش کریں تو تم اس کے لئے تیار نہ ہونا" کہ جس سے یہ غلط فہمی ابھر سکتی ہے اور یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ یہاں یہ قبا چونکہ خود اللہ نے پہنائی ہے۔ اس لئے شاید وہی ہمیشہ اس کا اہتمام کرے لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ استدلال صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ صرف ایک پیرایہ بیان اور مجاز ہے جس کے معنی اس سے زیادہ نہیں کہ حضرت عثمانؓ کا انتخاب ہوا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے اور حق بجانب ٹھہراتے ہیں اور پیشین گوئی کے ذریعہ آنحضرت ﷺ پہلے سے خبردار کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر باغی یا اشرار اس جائز اور صحیح انتخاب کو کالعدم قرار دینا چاہیں تو ان کے ان مشئوم عزائم کے سامنے سپر ڈالنے کی ضرورت نہیں اور اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کی خصوصیت نہیں۔ ہر خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ باغیوں کے سامنے جھکنے سے انکار کر دے۔

باقی رہی یہ حقیقت کہ آیا مجلسِ شوریٰ جس نے خلیفہ منتخب کیا ہے۔ اس کو عزل کا اختیار ہے یا نہیں یا وہ ہاؤس جس نے اسے چنا ہے وہ اسے عندالضرورت ہٹا سکتا ہے یا نہیں تو یہ بالکل دوسری بحث ہے۔ وَ أَمْرُ هُمْ شُورىٰ بَيْنَهُمْ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ ان کے مشورہ کو ماننے پر مجبور ہے۔ ہم نے مختلف پیرایوں میں اس پیش پا افتادہ حقیقت کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ خلیفہ کے نصب و قیام سے لے کر اس کے عزل و تعطیل تک کے تمام اختیارات براہ راست انسانوں سے متعلق ہیں کیونکہ جب یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اسے منتخب کرتی ہے تو

یہی جماعت لامحالہ اس کو اپنے راستے سے ہٹا دینے پر بھی قادر ہوگی۔ اس پر قادیانی معارضہ ملاحظہ ہو۔ "دنیا میں سینکڑوں ہزاروں کام ایسے ہیں کہ ان کو انسان سرانجام دینے کے بعد ازروئے قانونِ شریعت یا قانونِ قدرت بگاڑنے یا مٹانے کا مجاز نہیں۔ بیٹے کی پیدائش میں ماں باپ کو اس سے کہیں زیادہ دخل ہے جتنا خلیفہ کے انتخاب میں لیکن کیا شرعاً یا قانوناً ماں باپ کو اختیار ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو قتل کر سکیں۔ ایک واضح شرعی مسئلہ ہے زید اپنی مرضی سے اپنے ہی ہاتھوں سے پسینہ کی کمائی خرچ کر کے اینٹ اور چونے کی مسجد اللہ تعالیٰ کے نام پر تعمیر کرتا ہے لیکن کچھ دنوں کے بعد جب لوگ اس میں نماز پڑھنے لگ جاتے ہیں تو کدال لے کر اسے گرانے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ کیا کوئی اہلحدیث عالم ہے جو اس مسجد کے معمار کو اسے مسمار کرنے کی اجازت دے" (الفضل مورخہ 15 جنوری 52ء)۔ "قیاس مع الفارق" کا نام تو اہل علم نے سنا ہوگا مگر "مثال مع الفاروق" کا نہیں یہ معارضہ اسی ڈھب کا ہے کیونکہ صاحب، اگر بیٹا کسی کو قتل کر ڈالے اور اتفاق سے باپ عہدۂ قضاء پر فائز ہو تو سزا کا حکم سنائے گا یا نہیں۔ اسی طرح مسجد اگر بوسیدہ ہو جائے یا کافی نہ ہو یا نمازیوں کی ضروریات کو پورا نہ کر سکے تو تعمیرِ نو کی غرض سے اسے مسمار کیا جائے گا یا نہیں؟ اس میں فتویٰ طلب کون سی بات ہے۔ ہر بات کا تردید کرنا ضروری نہیں۔ قادیانی علماء کو خلیفہ صاحب کے مصالح سے الگ ہو کر اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے اور اس بات کی عادت ڈالنا چاہئے کہ کبھی کبھی دوسروں کی کہی ہوئی حق بات کو بھی مان لیا جائے۔

سیاسی پسِ منظر
برٹش
گورنمنٹ
سے
وفاداری

مرزائیت کا سیاسی پسِ منظر

میاں محمود صاحب آج کل اس بات کے درپے ہیں کہ کسی طرح مرزائیت کے خلاف اس الزام کی تردید کا سامان بہم پہنچائیں کہ مرزائیت نے متحدہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے کھونٹوں کو دلوں اور دماغوں میں گاڑنے کی کوشش کی ہے یعنی جسموں پر تو انگریزی حکومت کا قبضہ تھا ہی، مرزائیت نے یہ تبلیغ کی اور اپنے مریدوں کے دلوں میں یہ عقیدہ مرتسم کرنا چاہا کہ انگریز کی اطاعت، اس کی خیمہ برداری اور اس کے اثر ونفوذ کو اسلامی ممالک تک پھیلانے اور بڑھانے کی مہم عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہے۔قرآن وحدیث میں اور فقہ واصول کے مسائل میں تو ہم نے تاویل کی کاروائیاں دیکھی ہیں کیونکہ وہاں اس کے لئے کم از کم وجوہ متحملہ ہے وہاں ادبی، نحوی اور فقہی و اصولی نقطہ نظر سے ایسی گنجائشیں فی الواقع ہیں کہ تاویل کا امکان رہتا ہے۔ اور اس سے استنباطِ مسائل میں مدد ملتی ہے لیکن تاریخی حقیقتوں میں تاویل نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں سرے سے لچک ہی نہیں ہوتی اور پھر تاریخ بھی وہ کہ جس پر ابھی چند ہی برس گزرے ہیں۔ یہ قادیانی اعجاز، یا سخن سازی کا کرشمہ ہے کہ میاں صاحب (بشیر الدین محمود) مرزائیت کی ایک نئی تعبیر پیش کر رہے ہیں۔ اور بالکل نئی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ جس کو ماضی کی تحریرات اور روح سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔ ہمیں ان کی مجبوریوں کا احساس ہے یقیناً ہندوستان بٹ چکا ہے انگریزی اقتدار کا منحوس سایہ سروں سے اٹھ چکا ہے اور مرزائیت کے لئے قدرتاً آب وہوا میں وہ سازگاری نہیں

ہے جو انگریز کے وقت تھی اس لئے ظاہر ہے مرزائیت کو اب اس دم خم سے نہیں پیش کیا جا سکتا کہ ”حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مرزا صاحب کے نہ ماننے والوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ (خطبہ میاں 20 اکتوبر 1945ء) میاں محمود صاحب نے بار بار اس حقیقت کو ماضی میں پیش کیا ہے کہ مرزا صاحب چونکہ نبی تھے اس لئے نہ ماننے والوں کے کفر سے متعلق کیوں شبہات پیدا ہوتے ہیں؟“۔ مگر اس وقت یہ بات کہنا دشوار ہے کیونکہ اب معاملہ براہ راست مسلمانوں سے آ پڑا ہے۔ اور انگریز درمیان میں نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اب کھل کر میاں صاحب اس حقیقت کا اظہار نہیں کرتے۔ بلکہ اب تو الفضل والے یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ یہ اسی قبیل کی ایک بے وقوفی تھی جس طرح کی دوسرے مسلمانوں نے ایک دوسرے کو کافر ٹھہرا کر کی۔ گویا اب نہ مرزا صاحب نبی ہیں اور نہ انکار کفر کو مستلزم! یعنی لاہور اور قادیان و ربوہ میں مصالحت ہوگئی ہے۔ خدا کرے مولوی محمد علی بھی پرانے اختلافات کو بھول جائیں اور میاں محمود کو گلے لگا لیں۔

ہمیں اس سے کوئی دل چسپی نہیں کہ میاں صاحب پہلے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے یا اب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ ایسا اتفاق ہے جس کی مضرت سے ہم محفوظ ہیں۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ انگریز کی افتراق انگیز حکمتِ عملی نے انہیں پیدا کیا۔ انہیں پروان چڑھایا، مخصوص استعماری اغراض کی تکمیل کی خاطر اسلامی ممالک میں پھیلایا۔ انگریز کے بل بوتے پر انہوں نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اور آئندہ ارادے بھی ان کے بالکل وہی ہیں جو اس سے پہلے تھے۔ کہ انگریزی اقتدار عالم اسلامی میں اگر رہتا ہے تو مرزائیت کے لئے بھی گنجائش ہے۔ اور یہ اقتدار اگر ہٹتا اور سمٹتا ہے تو مرزائیت کے پنپنے کی بھی کوئی امید نہیں رہتی۔ انگریز سرپرست ہے اور

بقول ان کے ان کی تلوار ہے جس سے دشمنوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس تبدیلی اور نفاق کی ہم ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ اس سے ہماری خارجہ پالیس متاثر ہوتی ہے۔ عالم اسلامی میں انگریزی اقتدار کے کھونٹے اور استواری سے لڑتے ہیں۔ اور اسلام کو نا قابل تلافی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اس کے ثبوت میں ہم بغیر کسی تمہید و تبصرہ کے چند حوالے درج کرتے ہیں۔ ان کو پڑھئے اور اندازہ کیجئے کہ انگریز کی اس پود کے عقائد و عندیات کا عالم کیا ہے۔ اور ان کا وجود دنیائے اسلام کیلئے کتنا خطرناک ہے۔؟

''موجودہ زمانے کے متعلق جو پیشگوئیاں ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں انگریزوں کے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا اور'' کی ترقی کے لئے ہوں گے اور جہاں جہاں ان کی حکومت ہوگی وہاں احمدیت کی تبلیغ کے لئے اللہ تعالی کے فضل سے راستہ کھل جائے گا۔ (الفضل قادیان صفحہ 4 جلد 2 نمبر 211، 14 ستمبر 1939ء)

''ہماری تو دعا ہے کہ اس گورنمنٹ کو آسمانی گورنمنٹ ہر میدان میں کامیاب کرے اور بصرہ و بغداد تو کیا چیز ہے بلکہ ہماری تو دعا ہے کہ ساری دنیا میں اس کا راج قائم ہو جائے۔ (الفضل قادیان جلد 4، 6 مئی 1917ء)

''میں سولہ برس سے برابر اپنی تالیفات میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ مسلمانان ہند پر اطاعت گورنمنٹ برطانیہ فرض ہے''۔ اشتہار مرزا غلام احمد قادیانی مورخہ 10 دسمبر 1894ء ''میں نے بائیس برس سے اپنے ذمے فرض کر رکھا ہے کہ ایسی کتابیں جن میں جہاد کی مخالفت ہو اسلامی ممالک میں ضرور بھیج دیا کروں گا'' (اشتہار مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ تبلیغ رسالت جلد دہم صفحہ 26)

حضرت مسیح موعود (مرزا قادیان) فرماتے ہیں کہ ''میں وہ مہدی معہود ہوں اور گورنمنٹ برطانیہ میری وہ تلوار ہے جس کے مقابلہ میں ان علماء کی کچھ پیش نہیں

جاتی''۔ (الفضل قادیان جلد 6 صفحہ نمبر 42 مورخہ 7 دسمبر 1918ء)

''پورے بائیس برس سے ہمارے امام (مرزا غلام احمد قادیانی) اس خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ پچاس کے قریب ایسی کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں تالیف کی ہیں جن میں بار بار مسلمانوں کو اس گورنمنٹ کی اطاعت کی ترغیب دی اور جہاد کی مخالفت کی ہے۔ اور وہ کتابیں نہ صرف برٹش انڈیا میں بلکہ تمام اسلامی ممالک میں شائع کر دی ہیں اور اس مضمون کے اشتہارات بھی شائع کئے ہیں کہ ہمیشہ اس گورنمنٹ کا سچا خیرخواہ رہے۔ ہر ایک جو آئین بیعت کرتا ہے اس کو اپنے اندر یہ تبدیلی کرنی پڑتی ہے کہ وہ درحقیقت اس گورنمنٹ کا سچا خیرخواہ بن جائے۔

(ریویو آف ریلیجز 1902ء)

''اللہ تعالی نے اپنے سلسلے کی ترقی کیلئے اسی سرزمین کو چنا ہے جو گورنمنٹ برطانیہ کے ماتحت ہے۔ اس لئے بھی مبارکباد کے قابل ہے اگر کوئی سلطنت اس سے بڑھ کر اچھی اور عمدہ ہوتی تو خدا تعالی اپنے سلسلے کی نشو ونما کے لئے اسی کو چنتا۔ پس یہ حکومت جس قدر وسیع ہوگی ہمارا سلسلہ بھی وسیع ہوتا جائے گا۔

(خطبہ جمعہ میاں محمود مندرجہ الفضل جلد 4 نمبر 61، 6 مارچ 1917ء)

پس مرزا محمود تاریخ کے ان حقائق کو بدل دینے پر قادر ہیں؟ اور اب ان کی رائے انگریز کے متعلق یہ نہیں۔

پیغمبر اور حکومتِ باطلہ کی تائید؟

ربوہ کے سالانہ جلسہ (۱۹۵۰ء) کے موقعہ پر میاں محمود نے ایک اہم تقریر کے دوران اس الزام کی تردید کی ہے کہ مرزائیت کے معنی انگریزی حکومت کی خیمہ برداری کے رہے ہیں''۔ ان کے علاوہ دوسرے مقررین نے بھی خصوصیت سے اس

الزام کی تردید کی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ دفاع وتردید میں اس الزام کو سرفہرست رکھا گیا اور یہ کہا گیا کہ ''اگر مرزائیت کی جبینِ نیاز سے انگریز کی محبت وعقیدت کا نہ مٹنے والا داغ دور ہو جائے تو پھر مرزائیت کو بلا شبہ یہ حیثیت حاصل ہو جاتی ہے کہ دوسری مستقل بالذات تحریکات کے منہ آ سکے اور غور وفکر کا ہدف ہو سکے۔ ورنہ یہ خیال کیا جائے گا کہ انگریز نے متحدہ ہندوستان میں اپنی حکومت کو قائم رکھنے کیلئے جو جتن کیا ہے اور جس جس طرح بیسیوں فتنے اٹھائے ہیں ان میں ایک جتن اور فتنہ یہ بھی ہے'' ممکن ہے لوگوں کا ذہن اس حقیقت کی طرف متوجہ نہ ہوتا اور یہ الزام الزام ہی رہتا کہ مرزائیت کی پود انگریز کی لگائی ہوئی ہے۔ وہ تو مرزا صاحب نے خود للکار للکار کر اور پکار پکار کر کہا کہ ہم نے انگریز کی تعریف میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ انہیں اگر الماریوں میں ترتیب سے رکھا جائے تو پچاس الماریاں بھر جائیں۔ میں نے اس امر کی صراحت بھی کردی کہ احمدیت انگریز ہی کا خود کاشتہ پودا ہے۔

اس اعتراض کی تردید کی ضرورت دراصل اس لئے پیدا ہوئی کہ یکا یک انگریز کو یہاں سے جانا پڑا اور اہل وطن کو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ انگریزی مصالح نے اپنے قیام کو حق بجانب ٹھہرانے کیلئے چال اور دسیسہ کاری کی کن کن عجیب وغریب صورتوں کو پیدا کر رکھا تھا۔ آزادی کے اس دور میں احساسات نے ایک نئی کروٹ لی ہے اور نقد ونظر نے گزشتہ واقعات کا اس طرح جائزہ لینا شروع کیا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں مرزائیت کو کیوں نوازا گیا۔ اور حکومت کی چشم التفات خصوصیت سے اس نوع کے فتنوں کی جانب کیوں ملتفت رہی۔ میاں صاحب چونکہ بہت ذہین اور ہوشیار مذہبی لیڈر ہیں اس لئے حالات کی اس تبدیلی سے واقف ہیں اور ان کی ہدایت کے مطابق عام مرزائی علما اس تگ ودو میں ہیں کہ کسی طرح مرزائیت کی ایسی نئی تعبیر کی

جائے اور اسکے تاریخی چوکھٹوں کو اس انداز سے بدلا جائے کہ یہ بدرجہ آخر گوارا ہو سکے اور اس لائق ہو سکے کہ لوگ اس کا نام سن کر غور و فکر کیلئے کچھ رکیں حقارت و نفرت سے منہ نہ پھیر لیں۔

میاں صاحب کو ایسا کرنے کا حق ہے۔ جھوٹ اور باطل کی کوئی ترجمانی اس ڈھنگ کی نہیں ہو سکتی جو اس کو حق وصداقت سے بدل دے۔ اس صحبت میں ہمیں اس سے بحث نہیں کرنا ہے کہ مرزائیت فی الواقع انگریز کے اشارہ چشم وابرو سے معرض وجود میں آئی یا مخالفین کا یہ اعتراض تعصب پر مبنی ہے۔ چونکہ یہ بحث بہت پرانی ہے اور مرزائی خوب جانتے ہیں کہ ہم نے اس پر اب تک جو اعتراضات کئے ہیں ان میں ایک بھی پیش پا افتادہ نہیں۔ ہم جدت کے قائل ہیں، ہم یہ نہیں چاہتے کہ قارئین کرام کو باسی بھوروں پر ٹرخائیں۔ یہ اعتراض بجائے خود صحیح ہو یا غلط اتنا بغیر ادنیٰ اختلاف کے کہا جا سکتا ہے کہ مرزائیت سے متعلق یہ گمان کہ اس نے انگریز کی خوشامد اور تملق پر مشتمل کلمات کا اظہار کیا ہے اس کی گزشتہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اس کی مصالح ہمیشہ انگریز کی مصالح کے تابع رہی ہیں۔ ہم اس حقیقت پر صرف اس حیثیت سے غور کرتے ہیں کہ یہ ایک الزام اور اعتراض ہے جو بارہا نوک قلم پر اور زبان پر آ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ صاحب کو اس سالانہ جلسہ پر اس کی تردید کرنا پڑی۔

ہمارے نزدیک جس طرح نبوت کی ایجابی پہلو ہیں اسی طرح اس کے سلبی پہلو بھی ہیں۔ یعنی جس طرح نبوت کے کچھ مثبت لوازم ہیں اس کے مثبت متعلقات ہیں جو تمام انبیاء علیہ السلام میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو انبیاء علیہ السلام میں بالاتفاق نہیں پائی جاتیں۔ آپ اگر انبیاء علیہ السلام کی تاریخ اور ان کے احوال پر غور فرمائیں گے تو یہ حقیقت آپ منکشف ہوگی کہ ان سبھی چیزوں

میں ایک اہم یہ بھی ہے کہ ان پر کبھی اس قسم کا الزام نہیں لگایا جاتا کہ وہ ایک ظالم و غاصب حکومت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ کیونکہ مجرد اس شبہ پر کہ عدل اور انصاف کا سب سے بڑا نمونہ اور حق وصداقت کا ظہور اتم جور وستم کے سب سے بڑے پیکر کے سامنے سجدہ کنا ہے ان کو پایہء اعتبار سے ساقط کر دیتا ہے۔ انبیاء کے حق میں اس طرح کا الزام بعینہ اس طرح کا ہے کہ ہم کہیں کہ فلاں جج بہت قابل ہے لیکن بد دیانت ہے یا فلاں عورت پاکدامن ہے لیکن کئی مردوں سے دوستی بھی ہے یا یہ کہ کوئی شخص بہت شریف ہے۔ اگر چہ شراب اور جوئے کا بھی عادی ہے۔ یہ تمام دعوے اس قبیل کے ہیں جن کا ایک جزو دوسری چیزوں کی نفی کر رہا ہے کیونکہ جج کیلئے دیانت شرط اول ہے اور جو کچھ بھی ہو جج نہیں ہو سکتا۔ پاکدامنی عفاف کی مقتضی ہے اور شرافت کا یہ معنی ہے کہ ان لغویات سے کلی احتراز ہو۔ انبیاء جب ایسے ماحول میں آئیں جب ان کے سامنے ایک ظالم و غاصب گورنمنٹ موجود ہو تو ان کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ کریں۔ ان کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ ان کی دعوت غلط ہے، یہ اعتراض ہو سکے گا کہ یہ اپنا اقتدار چاہتے ہیں انہیں کچھ لوگ جادوگر بھی کہیں گے۔ جھٹلانے والوں کی بھی کمی نہیں ہوگی، لیکن ایسے لوگ بالکل نہیں ہوں گے۔ جو ان پر یہ الزام لگائیں کہ جور و استبداد کے جس ایوان کو یہ گرانے آئے ہیں اسی کی تعمیر میں کوشاں ہیں۔ موسیٰؑ فرعون سے اور ابراہیمؑ نمرود یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم نے آپ کی تعریف میں کوئی قصیدہ لکھا ہے۔ ان کے متعلق کوئی دوسرا شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے اپنی عمر میں ان سے تعاون کیا۔ حضرت یوسفؑ کی مثال سے غلط استدلال نہ کیا جائے۔ ہمارے اعتراض کی نوعیت یہ ہے کہ حکومت ظالم ہو اور اسکو بدلے بغیر کاروبار نبوت کی تکمیل نہ ہو سکتی ہو۔ اس صورت میں انبیاء کے منصب کا اولین تقاضا یہ

ہوتا ہے کہ اس کو ختم کیا جائے اور ایسی آب و ہوا مہیا کی جائے جس میں ایمان کا شجر طوبیٰ پنپ سکے۔

ہمارے اعتراض سے بچاؤ کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو یہ فرض کیا جائے کہ انگریز کی حکومت عدل و انصاف کی حکومت تھی اور ہمارے فکر و عمل پر اس طرح اثر انداز نہیں تھی کہ اس کا ہٹانا ضروری ہو، اور یا یہ مانا جائے کہ مرزا صاحب کی نبوت نبوت نہیں تھی محض ایک ڈھونگ تھا جو رچایا گیا تیسری کوئی صورت نہیں **فاختروا ھوانھما!**

شیطان سے دوستی اور اس کے چیلوں چانٹوں سے دشمنی

الفضل کے مدیر مولوی روشن دین تنویر آج کل مولانا مودودی اور خاکسار ندوی سے متعلق اس ڈھب سے لکھ رہے ہیں کہ گویا مرزائیت کے سلسلہء نفاق کے یہی دو بڑے دشمن ہیں۔ حالانکہ اس بدذوقی کے سب سے بڑے دشمن ہم دونوں نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہیں۔ جن کے دین سے مرزائیوں نے روگردانی اختیار کر رکھی ہے۔ یا پھر عقلِ سلیم اور فہمِ صحیح ہے جس سے ان کو کوئی حصہ نہیں ملا۔

گزشتہ اوراق میں ہم لکھ چکے ہیں کہ مرزائی اکابر انگریز پرستی کے روایتی داغ کو اب دھونا چاہتے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ محض ایک تبلیغی فرقہ ہیں۔ انگریز کا خود کاشتہ پودا یا ان کے عہدِ فتنہ پرور کی یادگار ہرگز نہیں۔ اس کے ثبوت میں ان کا یہ کہنا ہے کہ اگر ہماری جفاکشی و وفاداری کے افسانوں میں کوئی سچائی ہوتی تو ہم پادریوں کو دجال کیوں کہتے۔ جب ہم نے کھلے بندوں انہیں دجال ٹھہرایا ہے۔ ان سے بحثیں کی ہیں اور ان کے مطاعن کا جواب لکھا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انگریز کی خیمہ برداری کا قصہ جھوٹا ہے۔ ہم اس سلسلہ میں اسی عقل کو منصف قرار دیتے ہیں جس

سے قادیانی امت محروم ہے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ قادیانیوں نے انگریز کی خوشامد اس لئے گوارا کی کہ اس کی وجہ سے اس فتنہ کو پھیلنے اور پنپنے کا موقع ملا، اس لئے اس کی اطاعت وفرمانبرداری اختیار کی تاکہ اس کے بل بوتے پر مسلمانوں کو جی بھر کے گالیاں دی جاسکیں اور پادری کو اس لئے دجال ٹھہرایا کہ اس طرح نبوت کا کاروبار چمکتا تھا۔ نیز ایسا کرنے میں ضرور آزمائش کا بھی کوئی اندیشہ نہ تھا۔

یعنی مرزا صاحب خوب سمجھتے تھے کہ انگریز کی مخالفت میں ذرا بھی قلم کو جنبش دی تو ساری سلطانی ''دھری رہ جائے گی'' اور مفت میں جیل خانے کی ہوا کھانی پڑے گی۔ بخلاف اس کے پادری کے خلاف کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بالکل نہتا ہے اس کے ہاتھ میں اگر کوئی ہے تو وہ بے جان بائبل ہے اور ظاہر ہے کہ خطرہ اس ہاتھ سے نہیں ہے جس ہاتھ میں بائبل ہے بلکہ خطرناک وہ ہاتھ ہے جس میں سطوت و اقتدار کی باگ ڈور ہے۔ ان دونوں ہاتھوں میں جو کھلا ہوا فرق ہے مرزا صاحب اس کو کسی حد تک پہچانتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وہ مرزا صاحب جو مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت سخت ضدی تھے مسٹر ڈوئی کی عدالت میں قانون کی ایک ہی نگاہِ غضب سے ڈر کر یہ لکھ کر دے آتے ہیں کہ وعیدی پیشگوئیاں میں آئندہ شائع نہیں کروں گا۔ کیونکہ ایک فریق کا اس سلسلہ میں یہ بجا اعتراض تھا کہ جب کسی کی موت کی خبر اڑاتے ہیں تو اس کی تحقیق وتصدیق کے لئے خود انہیں زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔

حق گوئی کا تقاضا یہ تھا کہ مرزا اس پتھر سے دست وگریباں ہونے کے بجائے جو کسی شریف انسان کی طرف پھینکا جاتا ہے اس ہاتھ کو کوستے جس سے وہ پتھر پھینکا ہے۔ اس پیش پا افتادہ حقیقت سے کون نا آشنا ہے کہ پادری کو بھیجنے والا اور اسلام کے خلاف بدگوئی کرنے پر اس کی حوصلہ افزائی کرنے والا انگریز تھا۔ اسی نے

اس گروہ کو متحدہ ہندوستان میں دل آزار تنقید کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی تا کہ مسلمانوں میں اس طرح دینی عصبیت اور اسلامی حمیت وغیرت کے تقاضے آہستہ آہستہ کم ہوتے چلے جائیں اور اس کو بغیر کسی کھٹکے کے حکومت کرنے کا موقع ملے۔ جن لوگوں کا تھوڑا سا بھی مطالعہ ہے اور جن لوگوں نے اس لٹریچر پر سرسری نظر بھی ڈالی ہے جو عیسائی مشنریوں نے پیش کیا وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس میں آنحضرت ﷺ کی ذات کو خصوصیت سے ہدفِ مطاعن ٹھہرایا گیا ہے۔

پادری اس باریک نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے کہ مسلمان اگرچہ اسلام کی ان خوبیوں سے محروم ہو چکا ہے جن کا تعلق صاف ستھری معاشرت سے ہے۔ مذہب کے اس تصور سے بے گانہ ہو چکا ہے جو روزمرہ کی عملی زندگی کی تعبیر ہے اور اس حقیقت سے بے بہرہ ہو چکا ہے کہ سیاسی تغلب کے بغیر مذہب اکثر اپنی دلکشی کھو بیٹھتا ہے اور بجائے اس کے کہ پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کا موجب ہو سکے صرف انفرادی معاملہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ تاہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کے قلبی روابط کا اب بھی جو عالم ہے وہ اس نوعیت کا ہے کہ اگر یہ لگاؤ تازہ ہو جائے تب پورے مذہب کے زندہ ہو جانے کے امکانات پھر سے ابھر آتے ہیں۔ اس لئے یہ لازم آتا ہے کہ اس تعلق کو ٹھیس لگانے کے لئے پادریوں کی لام ڈوری مقرر کی جائے جو ایسی زہریلی کتابیں لکھیں اور ایسی ایسی گستاخیاں کریں جن سے یہ جذبہ مجروح ہوتا ہو۔ یہ خالص استعماری حربہ تھا جو استعمال کیا گیا۔ اس کا علاج یہ تھا کہ ایک طرف تو ان اعتراضات کا محققانہ جواب دیا جاتا۔ دوسری جانب روزہ مرہ کی زندگی میں جو نقائص پیدا ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کا پروگرام بنایا جاتا اور ان کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس انگریز سے ٹکر لی جاتی جس کی شہ اور ایماء سے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

چنانچہ اہلِ حق نے یہی کیا۔ آنحضرت ﷺ کی سیرتِ پاک پر بلند پایہ کتابیں لکھیں۔ زندگی کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا اوران کی اصلاح کیلئے مختلف تعلیمی واصلاحی ادارں کی بنیاد رکھی اور انگریز کے خلاف سینہ سپر ہوئے تا آنکہ پچاس ساٹھ سال کی مجاہدانہ سرگرمیاں رنگ لائیں اور انگریز ہندوستان اور پاکستان سے یک بنی و دوگوش رخصت ہوا۔

اس کے مقابلہ میں مرزا صاحب کا یہ کارنامہ کتنا شرمناک ہے کہ انہوں نے انگریز کی درازیٔ عمری کی دعائیں مانگیں۔ اس کی تعریف میں اتنا کچھ لکھا کہ پچاس الماریاں بھر جائیں۔ اسے اپنی تلوار ٹھہرایا، اس کی وفاداری کو مذہبی عقیدہ قرار دیا۔ بغداد کی فتح پر چراغاں کیا اور خوشی کے شادیانے بجائے۔ کیا پادری کو دجال کہہ دینا اتنا بڑا کمال تھا کہ اس کے بعد یہ تمام حرکات جائز ہو جاتی ہیں۔

مزہ جب تھا کہ اس انگریز کو دجال کہا ہوتا جس نے اپنی استعمار کی گاڑی کے آگے ان پادریوں کو جوتا، جس نے ان تبلیغی کوششوں کو اپنے حق میں استعمال کیا اور جس نے ان کو آنحضرت ﷺ کی توہین وتحقیر کی جرأت دلائی۔ یہ کہاں تک دیانت ہے کہ شیطان سے تو دوستی ہے جو شر کا اصلی منبع ہے اور اس کے چیلوں چانٹوں سے دشمنی ہے۔ اگر یہ پالیسی کاروبار نبوت کو زیب دیتی ہے تو پھر افسوس ہے کہ یہ نکتۂ جاں برحضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہ سوجھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذہن میں نہ آیا ورنہ آگ میں کودنے اور فرعون سے لڑائی مول لینے کے بجائے یہ زیادہ عافیت کا راستہ تھا کہ ان کی اطاعت کا دم بھرا جاتا اور ان کے کاہنوں اور مولوی فاضلوں کو دو چار گالیاں دے لی جاتیں۔

مرزائیت کی معذرت

کیا انگریز کے ابلیسی ہتھکنڈوں کی تائید سے اسلام کی اشاعت کا اہتمام ہو سکتا ہے؟ الفضل آج کل بہت بھپرا ہوا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں سلسلہء مرزائیہ کا سب سے بڑا دشمن سمجھے ہوئے ہے۔ خدا کرے کہ اس کا یہ گمان صحیح ہو، ہماری حالت اس کے مقابلہ میں یہ ہے کہ مرزائیت پر قلم اٹھاتے وقت ایک طرح کی شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ فکر وعمل اور عقیدہ وایمانیات کی اس بدذوقی پر گزشتہ زمانے میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب کوئی نیا پہلو آسانی سے نہیں سوجھتا۔

پچھلے صفحات میں ہم نے مرزائیت کی سیاسی پچھواڑ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس فتنہ کو انگریز کی مصلحتوں نے پیدا کیا اور انگریز ہی کی تائید وحمایت سے یہ پروان چڑھا اور تو اور خود مرزا صاحب آنجہانی اور مرزا محمود صاحب یہی سمجھتے رہے کہ نفاق وافتراق کا یہ شجرۂ خبیثہ اسی وقت تک تروتازہ رہ سکتا ہے جب تک انگریزی حکومت کا سایہ اس پر رہتا ہے۔ یہاں آزادیٔ وطن کی تحریکیں کامیاب ہوئیں اور وطنِ عزیز نے اجنبی اقتدار سے گلوخلاصی کرائی۔ مرزائیت کا یہ پیڑ خود بخود سوکھنا اور مرجھانا شروع ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ مرزائی اکابر کو آزادی وحریت کی یہ تحریکیں ایک آنکھ سے نہ بھائیں اور نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان کی سخت مخالفت کی بلکہ جہاد ہی کو منسوخ ٹھہرایا۔ خونی مہدی کا مذاق اڑایا بلکہ صاف صاف یہ کہنا شروع کیا کہ انگریز ہماری تلوار ہے۔ اگر یہ کند ہوئی یا چھن گئی تو کامیابی نہیں ہوسکتی اور ہماری اس تحریک کا طبعی طور پر دامن نفاق انگیزی سے وابستہ ہے۔ یہ دامن اگر بدقسمتی سے سمٹا تو مرزائیت کا پھیلاؤ بھی لامحالہ سمٹے گا۔ لہٰذا اس کی تائید ونصرت ہمارا دینی فرض ہے، اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ذلیل قسم کی خوشامد بھی کی یعنی اس ذلت کو بھی گوارا

کیا کہ مرزائیت انگریز کا خود کاشتہ پودا قرار پائے اور حمیت و غیرت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے متحدہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے زخموں پر یہ کہہ کر نمک چھڑکا کہ تم ایک بغداد کے سقوط پر روتے ہو ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا پر انگریزی پرچم لہرائے۔ اس سے قبل، ہم اس نوع کے تمام حوالوں کا ذکر کر چکے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزائیت کے سیاسی محرکات کیا ہیں؟ یہاں ان کو دہرانا نہیں چاہتے صرف اس کے جوابات پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ الفضل کا کہنا ہے کہ مرزائیت نے حکومتِ باطلہ کی تائید نہیں کی بلکہ عین اس وقت جب انگریزی اقتدار کے حلقے پھیل رہے تھے دلوں اور طبیعتوں پر افسردگی طاری تھی مرزائیت نے تبلیغ کا مرہم مہیا کیا اور ان لمحوں کو" انگریز کی سیاسی مخالفت میں ضائع کیے بغیر" اشاعتِ اسلام کیلئے مغتنم جانا اور ایسا تبلیغی کارنامہ انجام دیا جو علماء نہیں انجام دے سکتے تھے۔ میاں محمود اور الفضل نے اس کے علاوہ یہ بات بھی کہی ہے کہ مرزائیت اگر انگریز کی تائید کرتی تو اس کے خدا کی موت کا اعلان کس طرح اس کو زیب دیتا اور اسے کیونکر جرأت ہو پاتی کہ کھلے بندوں پادریوں کو دجال ٹھہرائے۔

ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ مذہبی تبلیغ کے معنی اسلامی نقطہ نظر سے یہ ہیں کہ پورے اسلامی نظام کی تبلیغ ہو۔ اس میں عقائد بھی ہیں، عبادات کی تفصیل بھی ہے اور سیاسیات کا مذکور بھی۔ وہ لوگ جنہوں نے اسلامی نظامِ حیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام کو دوسرے مذاہب سے ممیّز اور جدا قرار دینے والی ایک ہی چیز تو ہے کہ اس میں زندگی کا کوئی انفرادی یا اجتماعی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔ یہاں اگر پتھر کے بتوں کو توڑا گیا ہے تو ان بر خود غلط خداؤں کے طلسم، استبداد، کو بھی پاش پاش کیا گیا ہے۔ جن کی وجہ سے انسانیت کی تذلیل ہو رہی تھی۔ تبلیغ یہ نہیں کہ انگریز کی

سیاسی قوت تو بڑھائی جائے اس کے اقتدار و سطوت کے دائروں کو بغیر روک ٹوک پھیلنے دیا جائے۔ بے وقوفی یا مکاری ہے اس کیلئے دینی سہارے بھی مہیا کیئے جائیں اور پھر یہ سمجھا جائے کہ اسلام (جو عین اس کی ضد ہے) کی اشاعت کا اہتمام ہو رہا ہے۔

کیا عفونت کے پھیلانے سے عطر کی مہک میں اضافہ ہوتا ہے۔ مسموم آب و ہوا میں زندگی کی کوئی رمق باقی رہتی ہے؟ جھوٹ اور کذب کی اشاعت سے سچائی کی تبلیغ کے مواقع میسر آتے ہیں۔ اگر جواب یہ ہے کہ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوتا تو پھر بتایا جائے کہ شیطانیت کے استحکام سے نبوت کا کارخانہ کیونکر چل سکتا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ مرزائیت کا تصور دنیا اور دین دونوں سے متعلق سخت ناقص اور گھٹیا ہے، دین کا تصور ان کے نزدیک یہ ہے کہ یہ صرف بحث و مناظرہ کی آزادی سے تعبیر ہے۔ اگر چند مسائل پر کتابیں لکھی اور بیچی جاسکتی ہیں اور مناظرہ و بحث کا میدان گرم کیا جاسکتا ہے تو یہ اسلام کی بہت خوش بختی ہے۔ اسی طرح ریاست اور سٹیٹ کی ہمہ گیری اور زندگی کے ہر ہر خانہ میں اس کی دخل اندازی ان کی نظروں سے اوجھل ہے۔ یہ سمجھتے رہے کہ انگریز کی گرفت اگر چہ مضبوط سے مضبوط تر ہو جائے۔ تعلیم و اشاعت کے ذرائع پر بدستور اس کا قبضہ رہے اور ذہنوں کو خالص استعماری سانچوں میں ڈھالنے کی آزادی پر بھی کوئی قدغن نہ ہو تب بھی اسلام کے بڑھنے اور پنپنے کے واقعے اور احتمالات قائم رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص طاعون اور ہیضے کے مہلکات کو دعوت دے کر زندگی کی بچی کھچی رفتار سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے تو یہ بھی ناممکن تھا کہ انگریز کی تائید کر کے اسلام کے لئے کسی بھلائی کی توقع کی جاتی۔ بلکہ اگر آپ اسلام کی جامعیت سے واقف ہیں اور اس کے موجودہ دوائر کو بھی سمجھتے ہیں تب دیانتداری سے آپ کی یہ رائے ہو گی کہ غلط اور غیر دینی حکومت و اقتدار پر چوٹ لگائے بغیر یہ ناممکن

ہے کہ صحیح اسلامی اقدار کی اشاعت ہو سکے۔

باقی رہا آپ کا یہ کہنا کہ اگر ہم انگریز کے اتنے ہی خیر خواہ ہوتے تو مسیح کی وفات کا کیوں اعلان کرتے اور پادریوں کو کیوں دجال کہتے تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ بھی مرزائیت کے منجملہ متناقضات میں سے ہے۔ کیونکہ یہ تو بہر آئینہ واقعہ ہے کہ آپ لوگوں نے انگریز کی وفاداری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اب یہ آپ کو سوچنا چاہئے تھا کہ مسیح کی موت کا کیوں اعلان کریں جبکہ مسیح کے ماننے والوں سے دوستی کا رشتہ استوار ہو رہا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر مسیح کا انتقال ثابت نہ ہوتا تو مرزا صاحب کیونکر نبوت کا ڈھونگ رچاتے۔ انہوں نے اگر یہ کیا ہے تو مخالفت کی بناء پر نہیں بلکہ خود غرضی کے داعیہ سے متاثر ہو کر۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ انگریز ہرگز ان معنوں میں عیسائی قوم نہیں ہے کہ ان میں مذہبی روح کارفرما ہے۔ وہ تو عیسائی صرف ان معنوں میں ہیں کہ قومیت کی تعمیر میں اس عامل سے فی الجملہ ان کو مدد ملتی ہے ورنہ عیسائی عقائد وفروعات کی تردید میں خود انگریزوں نے جتنا کچھ لکھا ہے مرزا صاحب نے تو اس کا عشر عشیر بھی نہیں لکھا۔

جعل سازوں کی خاص تکنیک

جس طرح تندرسی اور بیماری میں ایک بین فرق ہے توانا و تنومند انسان قد وقامت سے، دم خم سے، چہرے اور بشرے کی رنگت اور بشاشت سے اور لب ولہجہ کی تازگی اور زور سے پہچانا جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں بیمار ولاغر آدمی کی ہر ہر ادا میں ضعف و دود ماندگی کی جھلک ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا جسم اس کی چال اور اس کی بات چیت تک میں ایک طرح کی لرزش اور کمزوری ضروری آجاتی ہے اور بغیر کسی دقتِ نظر اور حذاقت کے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ مرض نے اس پر بری طرح قبضہ

کر رکھا ہے۔ اسی طرح دل کے روگ اور دل کی بیماری کے بھی کچھ ایسے واضح اور کھلے ہوئے علائم ہیں کہ ایک عامی بھی معلوم کر سکتا ہے کہ اس پر شک و تذبذب کا کس درجہ دباؤ ہے اور کذب و افتراء نے کیونکر اس سے اطمینان اور چین چھین رکھا ہے۔

جھوٹے اور سچے آدمی میں ایک بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ جہاں صداقت اور سچائی سے بہرہ مند انسان بھاری بھر کم پن سے کام لیتا ہے وہاں جھوٹا اور کاذب انسان بات بات پر چھلک چھلک جاتا ہے۔ وہ چونکہ کھوکھلا ہوتا ہے اور بری طرح سے محسوس کرتا ہے کہ دل میں جھوٹ کا کھوٹ موجود ہے اس لئے خلا کو بھرنے اور کھوکھلے پن کو دور کرنے کے لئے غیر ضروری تائید اور توثیق کے کلمات استعمال کرتا ہے۔ اس کی بہترین مثال سورہ منافقون کی پہلی آیت ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ "یہ لوگ جن کے دلوں پر ایمان کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہیں جب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو کتنے مؤثق اور مؤکد لہجے میں اپنے اسلام کا یقین دلاتے ہیں کہ نشهد انك لرسول الله ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ یقیناً اللہ کے رسولؐ ہیں۔ یہاں یہ جان لینا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ قاعدہ کے اعتبار سے اس چھوٹے سے جملے میں منافقین نے تائید کا ڈھنگ سے استعمال کیا ہے۔ ایک تو قول کے بجائے شہادت کا لفظ چنا اور دوسرے "ان" لائے۔ اور تیسرے کلامِ تائید بڑھایا۔ جس سے غرض یہ تھی کہ کالم میں کہیں جھول نہ رہ جائے اور کوئی ایسا روزن نظر نہ آئے جس سے دل کے شک اور نفاق پر اطلاع ہو سکے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہی پیش بندی اور احتیاط کی ضرورت سے زیادہ یقین دہی کی کوشش اور اپنی سچائی کا ڈھنڈورا پیٹنا ان کے کذب کی کھلی ہوئی دلیل ہو جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام جو سچائی اور صداقت کی دولت سے بہرہ مند ہوتے ہیں ان

کے کلام میں قطع نظر ان کی دعوت کی محکمی اور سیرت کی پاکیزگی کے اس انداز کی کوشش نہیں ہوتی جسے غیر منطقی یقین دہی اور غیر ضروری تشہیر سے تعبیر کیا جا سکے۔ یہ یقیناً دعاوی بھی پیش کرتے ہیں۔ اور ان دعاوی کے ثبوت میں دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ لیکن کہیں یہ محسوس نہیں ہو پاتا کہ خدانخواستہ یقین واذعان کی نعمتوں سے محروم ہیں۔ ان کے کلام میں بڑی سنجیدگی ہوتی ہے۔ ایک طرح کا بھاری بھرکم پن ہوتا ہے اور گہرائی ہوتی ہے۔ بخلاف ایک جھوٹے اور جعل ساز کے وہ تبلیغ واشاعت کے لئے ایسے ڈھب اختیار کرتا ہے جن میں اتنی یقین وایمان کی جھلک نہیں ہوتی جس قدر یقین دہی کی غیر منطقی اور غیر کوششوں کی۔

یوں سمجھ لیجئے کہ سچا نبی اس کامیاب تاجر کی طرح ہے جس کے گودام مال سے بھرے پڑے ہیں اور جس کی دکانیں اجناسِ تجارت سے اس درجہ مالا مال ہیں کہ گاہک کو متاثر کرنے کیلئے اس کو غیر تاجرانہ ہتھکنڈوں کی قطعی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور جھوٹا نبی اس دیوالئے اور کھکھی مانند ہے جس کے گودام خالی اور دکانیں سامانِ تجارت سے تہی ہیں۔ یہ گاہک کو پھانسنے اور دھوکہ دینے کیلئے مجبور ہوگا کہ غیر ضروری ثقاہت کا اظہار کرے اور بازاری یا اشتہاری طریق سے کام لے۔ یعنی جب ایک شخص یہ کہتا ہے کہ یہ سونا ہے جسے میں بیچتا ہوں تو اس کے دل میں چونکہ جھوٹ کی کوئی خلش نہیں ہوتی اس لئے اس کا جھگڑا زیادہ تر مول تول پر ہوتا ہے اور جو ملمع کو سونا بنا کر بیچنا چاہتا ہے وہ بھاؤ اور قیمت کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا جتنا اس بات کو کہ ملمع کے بارے میں گاہک کے شک وتذبذب کو دور کیا جا سکے۔ وہ بار بار اس انداز کے جملے استعمال کرے گا کہ جناب یہ خالص سونا ہے۔ اگر یہ کھوٹا ثابت ہو جائے تو میں اتنا انعام دوں گا اتنے ہرجانے کا مستحق ٹھروں گا اور یہ میری سزا ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ غیرہ۔

ضروری تائید اور غیر منطقی یقین دہی اکثر جھوٹ پر دلالت کرتی ہے۔ یہ نفسیات کا موٹا اور مانا ہوا اصول ہے۔ مرزا صاحب کی تحریرات کا اس کسوٹی پر جائزہ لیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ ان کے دل کے روگ اور کھوکھلے پن نے ایسے ہتھکنڈوں کا بلا محابا استعمال کیا ہے۔ ان ہتھکنڈوں میں سے ایک معروف ہتھکنڈا انعامی اشتہارات کا ہے جن کا مرزا صاحب نے بڑا پروپیگنڈا کیا ہے۔ حالانکہ یہ تکنیک خاص جعل سازوں، مداریوں اور شعبدہ طرازوں کی ہے کہ وہ بات بات پر شرط بدلتے اور انعام مقرر کرتے ہیں ورنہ کوئی سنجیدہ اور ذی علم آدمی انعام بازی کی اس غیر معقول روش کا مرتکب نہیں ہوتا کیونکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دلائل میں جو نقص ہے اسے انعام بازی کے اعلانوں سے دور کرنا مقصود ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مرزا صاحب کا یہ انداز ہمارے بعض مناظرہ باز علماء نے بھی اختیار کرلیا ہے۔ حالانکہ یہ حد درجہ معیوب اور پایہء ثقاہت سے گری ہوئی بات ہے۔

نبوت سے دست برداری

سچائی جب اذعان و آگہی کے جھروکوں سے کسی کے دل پر اپنا پرتو ڈالتی ہے تو خوف و ہراس کے تاریک بادل یک قلم چھٹ جاتے ہیں اور ایک دم اطمینان و تسکین سے دل یوں بھر جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے بلائے ہوئے جادوگروں میں مقابلہ ہوتا ہے ...... جادوگر یہ کرشمہ دکھاتے ہیں کہ رسیاں اور لاٹھیاں ہو بہو سانپ معلوم ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا جاتا ہے کہ گھبراؤ نہیں تم ہی سربلند رہو گے لاٹھی ہاتھ سے پھینکو، جادوگر یہ دیکھ کر کہ وہی لاٹھی ایک اژدھا کی صورت میں ان کے بنے ہوئے سانپوں کو دبوچ اور نگل رہی ہے متحیر ہوتے

ہیں۔ پھر ان پر یہ بات کھلتی ہے کہ جادو اور اعجاز میں جو فرق ہے وہ جھوٹ اور سچائی کا ہے' حقیقت اور شعبدہ بازی کا ہے اور موسیٰ علیہ السلام واقعی اللہ کا نبی ہے جادوگر ہرگز نہیں۔ یہیں سے سچائی کی کارفرمائیاں ظاہر ہوتی ہیں' دل اتنے مضبوط اور بے خوف ہو جاتے ہیں کہ ابھی ابھی چند لمحے پہلے جو جادوگر فرعون کی عزت و اقبال کی دعائیں مانگ رہے تھے اور اس کے دبدبہ و رعب سے لرز رہے تھے اب صاف صاف اس کے سامنے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کے رب کو پہچان لیا

امنا برب ہارون و موسی (طہ ۷۰)

فرعون دھمکی دیتا ہے کہ اگر تم نے یہ گستاخی کی تو میں تمہیں سخت ترین تکلیفیں پہنچاؤں گا۔ آڑے ترچھے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالوں گا اور سولی پر ٹانگ دوں گا۔

ولا صلبنلم فی جذوع النخل (طہ ۷۲) ان کا ایک ہی جواب ہے۔

لن لوثرکذ علی ما جاءنا من البینات (طہ ۷۲)

کہ جو سچائیاں دل کی گہرائیوں تک اتر چکی ہیں ان کو کیسے چھوڑ دیں' سزا کا تمہیں اختیار ہے زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ مرجائیں گے' بلا سے تمہارا یہ فیصلہ زندگی تک ہی اثر انداز ہے اس کے بعد نہیں۔

فاقض ما انت قاض انما تقضی ھذہ الحیوۃ الدنیا (طہ ۷۲)

سعید بن مسیب کو گرفتار کر کے حجاج کے سامنے لایا جاتا ہے وہ پوچھتا

ہے کہو تمہیں کس انداز سے قتل کیا جائے گویا تمہارے جرموں کی سزا بھر آئینہ قتل ہی ہے اب تمہیں جو سوچنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ قتل کی کس صورت کو پسند کرتے ہو۔ حضرت سعید نے چمک کر جواب دیا کہ جو صورت تمہیں اللہ کے ہاں عذاب اور گرفت کی پسند ہے۔ اسی کے مطابق میرے ساتھ معاملہ کرو' کتنی دلیری اور بے خوفی ہے۔

اہل حق کا ہمیشہ یہی شیوہ رہا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ خود حق و صداقت میں اتنی لذت ہے کہ دنیا کی ہر ہر لذت اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ برونو ایک فلسفی ہے اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ پہلا نظام فلکی غلط ہے۔ اس کی پاداش میں اسے موت کی سزا سننا پڑتی ہے جس کو وہ پورے استقلال سے سنتا ہے۔ سچ بولنا اور بات ہے اور سچائی کے اظہار میں مصائب کو برداشت کرنا اور بات' سچ کی راہ میں مصائب جھیلنے ہی سے یہ معلوم ہو سکا ہے کہ دل میں اس کے ساتھ وابستگی کا کیا عالم ہے۔ ایک عام انسان سچائی اور جھوٹ کے ساتھ کوئی اخلاقی قدر و قیمت یا حکم وابستہ نہیں کرتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اصلی شے کامیابی و کامرانی ہے اور یہ دونوں اس کے حصول کے محض مختلف ذریعے ہیں۔ کبھی سچائی سے کام نکلتا ہے اور کبھی اس کو قربان کرکے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے لیکن ایک صداقت شعار انسان سچائی کو ذریعہ و وسیلہ نہیں سمجھتا بلکہ مقصدوغایت قرار دیتا ہے اور یہی سچے اور جھوٹے انسان میں حقیقی فرق ہے کیونکہ جھوٹا انسان بھی کبھی کبھی سچ بولتا ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ مسلسل سچ بولتا چلا جائے تاآنکہ اس کی راہ میں کوئی مصیبت برداشت کرنا پڑے کسی امتحان یا آزمائش سے دوچار ہونا پڑے۔

انبیاء علیہم السلام جو دنیا میں حق و صداقت کے سب سے بڑے علمبردار ہوتے ہیں ان کا معیار حق گوئی تو سب سے اونچا ہوتا ہے کیونکہ ان کا سچائی سے صرف یہی تعلق نہیں ہوتا کہ یہ امر واقعہ ہے لہٰذا اس کا اظہار ضروری ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ اس کے پہنچانے پر مامور ہیں۔ فاصدع بما تئومر انہیں اس کی ہرگز پرواہ نہیں ہوتی کہ لوگ کیا کہیں گے' حکومت کیا خیال کرے گی اور قانون و سزا کے حلقے کیونکر حرکت میں آئیں گے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ کے حکم کو اس کے بندوں تک پہنچانا ہے' حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کو دیکھئے کہ جب توحید کی سچائی نے ایک مرتبہ دل میں گھر کر لیا تو پھر آگ کے الاؤ میں کود جانا پسند کیا' مگر اس سچائی سے دستبردار نہیں ہوئے۔

انبیاء علیہم السلام کی سب سے بڑی اور موٹی پہچان ہی یہ ہے کہ حق کی تبلیغ میں وہ کتنے بے باک ہیں' کس درجہ جسور اور دلیر ہیں کیونکہ حق کوشی اور حق شعاری ہی کی تکمیل کا دوسرا نام تو نبوت ہے۔ اگر ایک مدعی نبوت شخص اسی حق کو چھپاتا ہے جس کے پہنچانے پر وہ مامور ہے اور اسی سچائی کے اظہار سے خائف ہے جس کی تبلیغ پر وہ خدا کی طرف سے مکلف ٹھہرایا گیا ہے تو اس مسخرے کو کون پیغمبر کہہ سکتا ہے یہ مصلحت اندیش ہو سکتا ہے' مفاد پرست اور ابن الوقت ہو سکتا ہے نبی ہرگز نہیں ہو سکتا۔

ایک مرتب جب مرزا صاحب موت و ہلاکت کی پیشین گوئیاں بانٹ رہے تھے اور از راہ نبوت خود ہی ان کی تکمیل کے سامان بھی مہیا کر رہے تھے مخالفین نے مسٹر ڈوئی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ انہیں اس بلیک میلنگ سے روکا جائے۔ مرزا صاحب کو یہ معلوم ہوا تو اوسان کھو بیٹھے اور خواجہ کمال

دین کی موجودگی میں نبوت سے دستبردار ہو گئے۔ آپ نے اقرار کیا کہ میں آئندہ اس ڈھنگ کی کوئی پیشین گوئی شائع نہیں کروں گا جو کسی کی موت سے متعلق ہو اور تو اور مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کو ایسے کلمات سے مخاطب نہیں کروں گا جن سے ان کو اذیت پہنچے۔

یعنی آپ نے اللہ میاں سے کہہ دیا کہ آئندہ ایسے الہامات نہ ڈسپیچ کئے جائیں جن پر کوئی مجسٹریٹ گرفتار کرے' فرمایئے! یہ نبوت ہے! اس سے زیادہ بے یقینی اور خوف و بزدلی کی کوئی مثال ہو سکتی ہے؟ کیا ہمارے ادنیٰ رضاکار بھی غیرت و حمیت کی اتنی توہین برداشت کر سکتے ہیں۔

